اِسلام کا مَعاشی نِظام

اور

اسلامی ریاست کا نظامِ مَحاصل

بانیٔ تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مکتبہ خُدّامُ القُرآن لاہور

36 کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون : 3-35869501

maktaba@tanzeem.org

جملہ حقوق بحق مرکزی انجمن خدام القرآن اور دینِ حق ٹرسٹ محفوظ ہیں!

مذکورہ بالا دونوں ادارے ڈاکٹر اسرار احمد ؒ کی کتابوں' تحریروں اور اقتباسات کے ضمن میں اجازت دیتے ہیں کہ کوئی شخص یا پبلشر اگر ڈاکٹر اسرار احمد ؒ کے علمی مواد کو شائع کرنا چاہتا ہے تو وہ اشاعت سے قبل چند ضوابط کی پابندی کرتے ہوئے' قیمتاً فروخت کرنے یا مفت تقسیم کرنے کے لیے' تحریری اجازت بلامعاوضہ مذکورہ بالا دونوں اداروں میں سے کسی ایک سے ضرور حاصل کرلے۔ اگر کوئی فرد / پبلشر معیّن کردہ ضوابط کی خلاف ورزی کرے گا تو اُس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔

نام کتاب ——— اسلام کا معاشی نظام

طبع اوّل تا ہشتم (ستمبر 1985ء تا اکتوبر 2010ء) ——— 16,000

طبع نہم: نظرثانی شدہ (نومبر 2019ء) ——— 1100

طبع دہم (مئی 2022ء) ——— 1100

ناشر ——— ناظم نشرواشاعت' مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت ——— 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور

فون: 3-35869501

مطبع ——— شرکت پرنٹنگ پریس' لاہور

قیمت ——— 120 روپے

email:publications@tanzeem.org
website:www.tanzeem.org

ترتیب

- تقدیم از ڈاکٹر اسرار احمد 5
- پیش لفظ از ڈاکٹر غلام رسول چودھری 7
- اسلام کا معاشی نظام 9
- سرمایہ اور محنت 39
- اسلام کا نظامِ محاصل 73
- عشری اور خراجی اراضی (پروفیسر رفیع اللہ شہاب) 86

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تقدیم

یہ کتابچہ راقم الحروف کی آج سے تین چار سال قبل کی دو تقریروں پر مشتمل ہے‘ پہلی زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں کی گئی تھی اور دوسری محکمہ محنت پنجاب کے زیر اہتمام مل مالکان اور مزدور لیڈروں کے ایک مشترک اجتماع میں کی گئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں ہی تقریریں میں نے حسبِ عادت ''رواروی'' میں کی تھیں اور میرا ہرگز خیال نہیں تھا کہ ان میں ایسی کوئی خاص یا اہم یا نئی بات ہے۔ لیکن ان دونوں کی پذیرائی میرے اندازے سے بہت بڑھ کر ہوئی۔ خصوصاً فیصل آباد کی تقریر کے صدر تھے ڈاکٹر غلام رسول چوہدری‘ جو خود معاشیات میں پی ایچ ڈی ہیں۔ ان کا تاثر تو اُن کے رقم کودہ پیش لفظ میں قارئین کے سامنے آہی جائے گا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اُس اجتماع میں چوہدری صاحب کے علاوہ مزید نصف درجن سے زائد معاشیات کے پی ایچ ڈی موجود تھے۔ بعد میں چائے کے اجتماع پر اُن سب حضرات نے متفقہ طور پر فرمایا کہ آج پہلی بار اسلام کا معاشی نظام کچھ سمجھ میں آیا ہے۔ میں نے اسے کچھ تو اُن حضرات کے حسنِ ظن پر محمول کیا اور کچھ اس پر کہ میری ہمت افزائی مقصود ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ میں نے اپنی ان تقریروں کو ہرگز قابل اشاعت نہیں سمجھا تھا۔ البتہ یہ ضرور خیال تھا کہ کبھی فرصت ملی تو نظر ثانی کے بعد اشاعت ہو سکتی ہے۔ لیکن محترم چوہدری غلام رسول صاحب نے ان کی اس درجہ قدر افزائی فرمائی کہ دونوں تقریروں کو خود ٹیپ سے منتقل کرا کے‘ اپنے ذاتی خرچ پر ایک کتابچے کی صورت میں غالباً دس ہزار کی تعداد میں طبع کرایا‘ اور مفت تقسیم کیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس کا اجر عطا فرمائے۔ آمین!

ادھر کچھ عرصہ سے بعض احباب کا شدید تقاضا تھا کہ ہم اسے خود اپنے اہتمام میں بھی شائع کریں۔ اس ضمن میں بھی چوہدری صاحب نے مزید کرم یہ فرمایا کہ کتابت شدہ

کاپیاں عنایت فرمادیں۔ چنانچہ یہ کتابچہ بالکل مِن وعَن اُسی صورت میں شائع ہو رہا ہے جس میں چوہدری صاحب نے طبع کرایا تھا۔ اس ضمن میں قارئین سے یہ معذرت کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ دونوں تقریروں میں بعض مضامین مکرر آئے ہیں۔ اب یہ آپ کے ذوق پر منحصر ہے' چاہیں تو اسے 'قندِ مکرر' سے تعبیر فرمالیں' اور چاہیں تو بدمذاقی پر محمول کرلیں۔

میں چونکہ نہ معاشیات کا باضابطہ طالب علم ہوں' نہ فقہ اسلامی کا ماہر —— لہٰذا اس میں غلطیاں لازماً ہوں گی۔ جو حضرات اس ضمن میں مجھے متنبہ فرمانے کی تکلیف گوارا فرمائیں ان کا پیشگی شکریہ!

ان دو تقاریر کے علاوہ اس کتابچے میں موضوع کی مناسبت سے دو مختصر چیزیں مزید شامل کی جارہی ہیں: ایک راقم کا ایک مختصر مقالہ جو اُس نے ''اسلام کا نظامِ محاصل'' کے عنوان سے لائنز کلب لاہور کے سالانہ اجلاس میں پڑھا تھا۔ اس میں اسلام کے معاشی نظام کے بارے میں بعض اُصولی باتیں تو پھر مکرر آگئی ہیں' تاہم اہلِ فکر کے لیے چند نئے نکات قابل غور موجود ہیں۔ اور دوسرے پاکستان کے 'نظامِ محاصل' کے اس اہم ترین مسئلے پر کہ آیا یہاں کی اراضی عشری ہیں یا خراجی' پروفیسر رفیع اللہ شہاب صاحب کا ایک مختصر مراسلہ جو 'میثاق' جنوری فروری ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا تھا' جس میں اس موضوع پر نہایت اہم حوالے موجود ہیں۔

خاکسار **اسرار احمد** عفی عنہ

لاہور ۲۲/اگست ۱۹۸۵ء

ب ن (نومبر ۲۰۱۹ء): پیش نظر کتاب ''اسلام کا معاشی نظام'' ہمارے مکتبہ میں کافی عرصے سے آؤٹ آف سٹاک تھی۔ طبع جدید کے موقع پر اسے قدرے نظر ثانی کے بعد جدید کمپیوٹر کمپوزنگ کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے۔ بعض مقامات پر حسبِ ضرورت قرآنی آیات اور احادیثِ نبویہ کے متون' تراجم یا حوالہ جات کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس طرح کتاب کے ظاہری اور معنوی حسن میں یقیناً اضافہ ہوا ہے۔ (مدیر شعبہ مطبوعات)

پیش لفظ

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب دینی حلقوں میں تو کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ڈاکٹر صاحب اس اعتبار سے ایک منفرد حیثیت کے مالک ہیں کہ آپ کی بنیادی تعلیم سائنس اور طب کی ہے' مگر آپ کی نمایاں خدمات دین اسلام کی تعلیم و تبلیغ میں نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ایسے وقت میں طب کے پیشہ کو ترک کر کے اپنی تمام تر صلاحیتوں اور اوقات کو دین کے احیاء کے لیے وقف کیا جب اُمت قحط الرجال کا شکار تھی —— لہٰذا ڈاکٹر صاحب نے علامہ اقبال کے شعر ؎

ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

کے مصداق اُمت کی پاسبانی فرمائی۔

راقم الحروف جب ایچی سن کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے تعینات تھا اُس وقت ڈاکٹر صاحب کو وقتاً فوقتاً زحمت دیتا رہا' مگر ہر دفعہ ڈاکٹر صاحب نے ہماری دعوت کو شرفِ قبولیت بخشا اور نہ صرف کالج کے طلبہ اور اساتذہ کو اپنے ایمان افروز خطابات سے نوازا بلکہ کالج کی جز وقتی لیکچررشپ بھی قبول فرمالی۔ اس دوران ڈاکٹر صاحب کے دو اہم خطابات ''نجات کی راہ'' اور ''علامہ اقبال اور ہم'' راقم نے بڑے شوق سے طبع کروائے اور بہت پسند کیے گئے۔

بعد ازاں جب مجھے زرعی یونیورسٹی فیصل آباد کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا تو ڈاکٹر صاحب تکلیف فرما کر وقتاً فوقتاً یونیورسٹی تشریف لے جاتے رہے اور خطاباتِ جمعہ کے علاوہ ''سیرۃ النبی ﷺ'' اور ''اُمتِ مسلمہ کا ماضی' حال اور مستقبل'' جیسے اہم موضوعات پر یادگار خطاب فرمائے اور ڈاکٹر صاحب نے زرعی یونیورسٹی کے سینیٹ اور سنڈیکیٹ کی رکنیت بھی قبول فرمالی۔

راقم کا گہرا احساس یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو اللہ تعالیٰ نے جو قوتِ استدلال' اندازِ بیان اور قوتِ افہام عطا فرمائی ہے وہ اس نے آج تک کسی پروفیسر میں نہیں پائی۔

معاشیات کے میدان میں اسلام کی اصل تعلیمات کیا ہیں؟ یہ وہ مسئلہ ہے کہ جس پر کوئی واضح بات تا حال سامنے نہیں آئی تھی۔ ہماری کوشش زیادہ تر یہی رہی کہ Western Economics میں چند تبدیلیاں کر کے اسی کو اسلام کے مطابق ڈھالا جائے' جو مناسب نہیں۔ چونکہ راقم بھی اسی شعبۂ علم سے تعلق رکھتا ہے اس لیے اس کو اِس مضمون سے خاص دلچسپی تھی۔ لہٰذا ہم نے اس معاملے میں بھی ڈاکٹر صاحب سے رجوع کیا۔ اور ڈاکٹر صاحب نے زرعی یونیورسٹی کے کلیہ معاشیات و دیہی عمرانیات کے تحت طلبہ و ماہرینِ معاشیات سے ''اسلام کا معاشی نظام'' کے موضوع پر مفصّل خطاب فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب کے اس خطاب سے جہاں اسلام کی تعلیمات کے نئے گوشے سامنے آئے وہاں یہ امر سب حاضرین کے لیے حیرت کا باعث ہوا کہ ڈاکٹر صاحب معاشیات کے نہ تو کبھی طالب علم رہے تھے اور نہ ہی اس شعبہ سے کبھی متعلق۔ لیکن اپنی بصیرتِ باطنی کی بنیاد پر ڈاکٹر صاحب ایک بہت بڑے معیشت دان معلوم ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس خطاب میں اسلام کی اصلی تعلیمات کو قرآن حکیم کی محکم آیات کے حوالے سے پیش کیا اور عام معمول کے خلاف ڈاکٹر صاحب نے موجودہ نظاموں میں سے کسی پر اسلام کی مہر تصدیق ثبت کرنے کی بجائے اسلام کی اپنی تعلیمات کو پیش کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ اشتراکی نظام کا آئیڈیل ''مساوات'' اور سرمایہ دارانہ نظام کا آئیڈیل ''آزادی'' ہے —— اسلام مساوات اور آزادی دونوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے' جب کہ اس کا اصل نعرہ ''عدل'' ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اسلام کے ''روحانی'' اور ''قانونی'' نظام کا جو فرق بیان فرمایا اس نے تو گویا اس موضوع پر جملہ پیچیدگیوں کو حل کر دیا۔

مجھے اُمید ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا یہ مقالہ تحقیق و تجسس کی نئی راہیں کھولے گا اور ملکی معیشت کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لیے ممدّ و معاون ثابت ہوگا۔

غلام رسول چودھری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام کا معاشی نظام

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِينُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَ نُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ، وَ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ. وَ نَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَنَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ، فَصَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ تَسْلِيماً كَثِيرًا كَثِيرًا —— اَمَّا بَعْدُ :

حضرات! اس دور کے بارے میں ایک بات عام طور پر کہی جاتی ہے جو کچھ زیادہ غلط بھی نہیں ہے کہ یہ معاشیات کا دَور ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آج کا انسان بنیادی طور پر معاشی انسان بن کر رہ گیا ہے۔

اجتماعیاتِ انسانی میں بھی یقیناً معاشیات اور اِقتصادیات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اور ہمارے ملک میں اسلام کی جانب جو قدم اٹھانے کی کوشش کی جارہی ہے اس کے ضمن میں فطری طور پر یہ سوال ذہنوں کو پریشان کر رہا ہے کہ اسلام کا اقتصادی نظام کیا ہے؟ بعض لوگوں نے اسلامی اقتصادیات کا جو تصور پیش کیا ہے اس کی وجہ سے ایک تصور لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہے کہ شاید اسلام کا اقتصادی نظام ہمارے موجودہ نظام میں زکوٰۃ اور عشر کے اضافے اور ذرا مزید ہمت کر کے سود کی لعنت کو ختم کر دینے کا نام ہے۔ گویا معیشت کا بنیادی ڈھانچہ یہی رہے گا اور بس اتنا سا تغیر و تبدّل ہی مطلوب ہے۔ اور اسی بنیاد پر کچھ لوگ بد نیتی کے تحت اور کچھ مغالطے سے لوگوں کو بدظن کر رہے ہیں کہ اسلام کے پاس معاشی مسائل کا کوئی حقیقی، واقعی اور مؤثر حل موجود نہیں ہے۔ میں اسی لیے آج یہ جرأت کر رہا ہوں کہ اسلام کے معاشی نظام یا قرآن مجید کی اقتصادی ہدایات کے بارے میں کچھ معروضات پیش کروں۔

حضرات! میں اپنی اصل گفتگو کا آغاز کرنے سے قبل دو معذرتیں پیش کروں گا اور دو مقدمات۔

معذرتیں

الف: پہلی معذرت تو یہ کہ اصولاً اسلامی معاشیات پر گفتگو کرنے والے شخص کو جدید معاشیات اور اقتصادیات کا علم بھی براہِ راست ہونا چاہیے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ قرآن وحدیث اور فقہ پر بھی اس کی نظر بہت گہری ہو۔ ورنہ کم از کم کسی ایک میدان کے اعتبار سے تو وہ یہ دعویٰ کر سکے کہ اس کے علم کی تحصیل کسی درجے میں اس نے مکمل کر لی ہے۔ جبکہ مجھے ان میں سے کسی چیز کا دعویٰ نہیں —— میں اپنے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں قرآن مجید کا طالب علم ہوں۔ البتہ قرآن چونکہ هُدًی لِّلنَّاسِ (تمام انسانوں کے لیے راہنمائی) ہے اور اس کا اصل موضوع ہی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے متعلق رہنمائی دینا ہے' لہٰذا اصولاً بھی یہ ممکن نہیں تھا اور فی الواقع بھی ایسا نہیں ہے کہ معاشیات جیسے اہم موضوع پر کوئی ہدایات اس میں نہ دی گئی ہوں۔ چنانچہ اس میں جہاں عبادات کے متعلق احکام بیان ہوئے ہیں اور ان کی حکمتیں بھی زیر بحث آئی ہیں' اسی طرح زندگی کے تمام گوشے اس میں موضوعِ بحث بنے ہیں اور اس ضمن میں اُحکام بھی وارد ہوئے ہیں اور ان کی حکمتوں کا بیان بھی ہوا ہے۔ چنانچہ معاشیات کے اعتبار سے بھی قرآن مجید میں ایک طرف تو کھلے کھلے احکام بیان کیے گئے ہیں' دوسری طرف کچھ ایسے مقاصد اور بنیادی حکمتوں کی نشان دہی کی گئی ہے جن کا لحاظ ان احکام میں رکھا گیا ہے۔ لہٰذا میں ان دونوں پہلوؤں سے کوشش کروں گا کہ اپنے مطالعے کا حاصل آپ حضرات کے سامنے لاؤں۔

ب: دوسری معذرت یہ ہے کہ میں آپ حضرات کے سامنے اپنی بات نہ فلسفیانہ انداز میں پیش کرنے کی اہلیت رکھتا ہوں اور نہ ہی میں اس کی کوشش کروں گا۔ میری کوشش یہ ہوگی کہ جن اصطلاحات کے لوگ عادی ہو چکے ہیں انہی کے حوالے سے بات کروں تاکہ بات فوراً سمجھ میں آ جائے۔ مثلاً Capitalism (سرمایہ داری نظام) اور Socialism (اشتراکی نظامِ معیشت) کی اصطلاحات ہمارے ہاں معروف ہیں۔ لوگ اکثر و بیشتر ان اصطلاحات اور ان کے مفہوم سے بنیادی طور پر واقف ہیں اور

جانتے ہیں کہ یہی وہ نظام ہائے معیشت ہیں جو اس وقت بالفعل دنیا میں قائم ہیں[1]۔ مجھے خوب اندیشہ ہے کہ اس طرح عین ممکن ہے کہ مجھ پر over simplification کا الزام عائد کیا جائے یا کوئی صاحب یہ سمجھیں کہ میں جدید اصطلاحات سے مرعوب ہوں' لیکن اس کے باوجود میں بات پہنچانے کے لیے اس طریق کو اختیار کر رہا ہوں' کیونکہ میرے نزدیک بات ذہنوں تک پہنچانے کے لیے یہی طریقہ سب سے مؤثر ہے۔

دو مقدمات

اب میں چاہتا ہوں کہ دو مقدمات آپ کے سامنے رکھوں' کیونکہ میری گفتگو انہی پر مبنی (based) ہوگی۔

پہلا مقدمہ: اس اصول پر مبنی ہے کہ دنیا کے ہر نظام کے دو پہلو ہوتے ہیں: ایک فکری اساس اور دوسرا عملی ڈھانچہ۔ یہ دونوں پہلو باہم مربوط ہوتے ہیں اور کسی بھی نظام کو اس کی فکری اساس سے ہٹا کر موضوعِ گفتگو نہیں بنایا جا سکتا۔ اسی طرح اسلام کے بارے میں نظریاتی اساس اور بنیاد کا معاملہ انتہائی اہم ہے' جس کو ہم اصطلاحاً ایمان سے تعبیر کرتے ہیں —— اسلام درحقیقت ایمان پر قائم ہے۔ اللہ پر یقین کہ اس کائنات کا ایک خالق اور مالک ہے۔ اُس نے اس کائنات کو اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی (ایک متعین وقت تک) کے لیے پیدا کیا ہے۔ یہ ہمیشہ باقی رہنے والی چیز نہیں ہے اور ہماری زندگی یہ دُنیوی زندگی ہی نہیں بلکہ اصل زندگی موت کے بعد ہے۔ انسان کا اصل مسئلہ اُس زندگی سے متعلق ہے' اِس زندگی سے نہیں۔ گویا ہماری اعتقادی اساس اور نظریاتی بنیاد کے اعتبار سے نسبت و تناسب (ratio and proportion) میں اِس دُنیوی زندگی کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں' یہ تو گویا نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ عارضی اور فانی ہے جب کہ وہ ابدی ہے اور ہمیشہ کی زندگی ہے۔ یہ ہمارے ایمان کی دو بنیادیں ہیں جو قرآن حکیم کی ایک ہی آیت میں ان مختصر الفاظ میں سموئی ہوئی ہیں: ''اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ'' کہ

---

(۱) ہم اس بات کے مدعی ہیں کہ ہمارے پاس ایک تیسرا نظامِ معیشت ہے' جو ان دونوں کے اچھے پہلوؤں کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے' لیکن یہ چیز اُس وقت تک صرف ایک دعویٰ کی حیثیت رکھتی ہے جب تک کسی معاشرے' یا کسی ملک میں یہ نظام قائم کر کے نہ دکھایا جائے۔

اللہ ہی ہمارا مبدأ بھی ہے اور معاد بھی۔ یعنی ہم اللہ کے پاس سے آئے ہیں اور اُسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ ایمان اگر واقعتاً دل میں موجود ہو تو اس کا حاصل تو یہی ہے کہ دنیا میں اس طرح زندگی بسر کی جائے جیسے کوئی اجنبی ہو یا راہ چلنے والا مسافر[1]۔ ایک راہ گزر کو اپنے راستے سے جو دلچسپی ہو سکتی ہے اس دنیا اور اس کے متعلقات کے ساتھ اس سے زائد دلچسپی از رُوئے ایمان درست نہیں ہے۔ اسلام کی اس بنیاد سے دو نتیجے اخذ کیجیے۔

(۱) پہلا یہ کہ اگرچہ سوشلزم اور سرمایہ دارانہ نظام بظاہر تو ایک دوسرے کی کامل ضد ہیں' کیونکہ نظام کے اعتبار سے ایک مشرق کی بات ہے تو دوسری مغرب کی' لیکن فکری بنیاد ان دونوں کی ایک ہی ہے' یعنی مادّہ پرستی۔ یہ مادّیت (Materialism) ہی تھی جس نے ایک قدم اور آگے بڑھا کر جدلی مادّیت (Dialectical Materialism) کی شکل اختیار کر لی ہے۔ مادّیت ہی بنیاد ہے مغربی جمہوریت (Western Democracy) کی کہ جس کے ساتھ کیپٹلزم کا ضمیمہ لگا ہوا ہے اور اس مادّیت ہی کی ایک زیادہ ترقی یافتہ شکل جدلی مادیت ہے' جس سے وہ دوسرا نظام پھوٹا ہے جسے ہم سوشلزم اور کمیونزم یا اس کے مختلف شیڈز (shades) سے پہچانتے ہیں —— ایک بات تو یہ پیش نظر رہے کہ اسلام کا معاملہ ان دونوں سے بنیادی طور پر جدا ہے۔[2]

(۲) اور دوسری بات ذہن میں یہ رکھنا ہوگی کہ چونکہ اسلام کا نظام اپنے تفصیلی ڈھانچے سمیت صرف اپنی بنیاد پر ہی قائم ہو سکتا ہے اور یہ کسی دوسرے نظام کی پیوند کاری قبول نہیں کرتا' لہٰذا پہلے اس نظریاتی بنیاد کا استحکام ضروری ہے' اس لیے کہ اسلام کھڑا ہوگا تو ایمان کی بنیاد پر۔

دوسرا مقدمہ: گو ایمان کی رُو سے اصل اہمیت معاد (آخرت) کی ہے' معاش کی

(۱) حضور اکرم ﷺ نے ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے شانے پکڑ کر از راہِ شفقت فرمایا: ((کُنْ فِی الدُّنْیَا کَاَنَّکَ غَرِیْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِیْلٍ)) ''دُنیا میں اس طرح رہو جیسے کوئی اجنبی یا راہ چلتا مسافر۔'' (صحیح البخاری و سنن الترمذی)

(۲) اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ ۔ کفر کے کتنے بھی رنگ (shades) ہوں' کتنی ہی مختلف صورتیں ہوں وہ درحقیقت ایک ہی شے ہے' ایک ہی ملت ہے۔

نہیں' یہ دُنیا اور اس کا ساز و سامان یہیں رہ جانے والا ہے اور انسانوں کے لیے ثانوی اہمیت کا حامل ہے' لیکن ساتھ ہی ساتھ اسلام کے پورے نظامِ فکر و عمل میں عدل و قسط اور انصاف کے قیام کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی جو شانیں بیان ہوئی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ ﴿قَآئِمًا بِالْقِسْطِ﴾ (آل عمران:۱۸) یعنی عدل و انصاف کو قائم کرنے والا ہے۔ پھر اسی کا حکم سورۃ النساء میں ان الفاظِ مبارکہ میں وارد ہوا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ﴾ (النساء:۱۳۵)

''اے ایمان والو! عدل و انصاف کے قائم کرنے والے اور اللہ کے گواہ بنو۔''

اور سورۃ المائدۃ میں یہی حکم عکسی ترتیب سے وارد ہوا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ﴾ (المائدۃ:۸)

''اے ایمان والو! اللہ کے لیے پوری قوت کے ساتھ کھڑے ہونے والے اور عدل و انصاف کے گواہ بن جاؤ۔''

ان سے اہم تر ہے یہ حقیقت کہ قرآن حکیم میں ایسی آیات بھی ہیں جن میں بالکل معین طور پر ارشاد فرمایا گیا ہے کہ کتابوں کے نازل کرنے اور رسولوں کے بھیجنے کا اصل مقصد اور اسلام کے پورے نظام کا مرکزی خیال ہی عدل و قسط کا نظام قائم کرنا ہے۔ گویا اسلام کے نزدیک یہ ایک اہم قدر ہے۔ فرمایا:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ﴾ (الحدید:۲۵)

''ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو واضح نشانیاں دے کر اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ عدل و انصاف پر قائم ہوں۔''

انبیاء و رسل علیہم السلام کے بارے میں اس عام قاعدہ کلیہ پر مستزاد ہے وہ ہدایت جو معین طور پر نبی اکرم ﷺ کو دی گئی:

﴿فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۭ﴾ (الشوریٰ:۱۵)

''تو (اے محمد ﷺ) آپ اسی دین کی طرف لوگوں کو بلاتے رہیے اور جیسا کہ آپ کو حکم ہوا ہے اسی پر قائم رہیے اور ان کی خواہشات کی پیروی مت کیجیے' اور کہہ دیجیے کہ جو کتاب اللہ نے نازل فرمائی ہے میں اس پر ایمان رکھتا ہوں' اور مجھے حکم ہوا ہے کہ تمہارے درمیان انصاف کروں۔''

جب مسلمان ایران پر حملہ آور ہوئے تو ایرانیوں نے حملے کی وجہ دریافت کی' تو فاتحِ ایران حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے ان الفاظ میں ان کو جواب دیا:

''ہم تو بھیجے گئے ہیں (خود نہیں آئے ہیں) کہ لوگوں کو جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان کے نور میں اور بادشاہوں کے ظلم و ستم کے پنجے سے نکال کر اسلام کے عدل میں لے آئیں۔''

اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا وہ خطبہ جو آپ نے بیعت خلافت کے بعد ارشاد فرمایا تھا اور جو واقعتاً ایک اسلامی ریاست کے مقاصد کو متعین کرتا ہے' اس میں وہ جملہ یاد رکھنے کے قابل ہے:

''تم میں سے ہر قوی میرے لیے ضعیف ہے جب تک اس سے حق وصول نہ کرلوں اور تم میں سے ہر ضعیف میرے لیے قوی رہے گا جب تک اس کو اس کا حق نہ دلوا دوں۔''

تو گویا قیامِ عدل و قسط اسلام کا مرکزی خیال ہے۔

حال ہی میں جو سالانہ قرآن کانفرنس کراچی میں ہوئی اس میں ایک صاحب نے بڑی عمدہ بات کی طرف توجہ دلائی کہ اس وقت جو دو نظام دنیا میں قائم ہیں' ان میں ایک ایک لفظ مرکزی اہمیت کا حامل ہے۔ کیپٹلزم کا مرکزی خیال آزادی (freedom) ہے جبکہ کمیونزم کا مساوات (equality) ہے۔ یہ ان لوگوں کے سلوگن ہیں۔ ذہن میں رہے کہ یہ دونوں بڑی اہم انسانی قدریں ہیں۔ لیکن اسلام کا بنیادی خیال (basic theme) ''عدل'' ہے۔ وہ آزادی اور مساوات دونوں کو عدل کا پابند کرتا ہے۔ گویا وہ آزادی اور مساوات کے درمیان بھی عدل قائم کرتا ہے تاکہ نہ آزادی اتنی بڑھ جائے کہ مساوات کو بالکل ہڑپ کر جائے' یعنی freedom at the cost of equality نہ ہو اور نہ ہی

مساوات کا ہوا اتنا بڑھ جائے کہ وہ آزادی کو بالکل نگل جائے' یعنی equality at the cost of freedom بھی نہ ہو۔ اسلام کا مرکزی تصور عدل ہے اور وہ اس عدل کو ہر گوشۂ زندگی میں نافذ کرنا چاہتا ہے۔

قیامِ عدل وقسط کی اہمیت

انسانی اجتماعیات کے بہت بڑے عالم اور جدید معاشرتی اور سماجی مسائل کی طرف دو صدی قبل توجہ دلانے والے اور ان کا قرآن و حدیث کی روشنی میں حل پیش کرنے والے عظیم مجدّدِ دین امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی ؒ نے اسلام میں عدل وقسط کے قیام کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے' اور اس پر انہوں نے بہت عمدہ دلیل قائم کی ہے کہ اسلام یہ عدل اس لیے قائم کرنا چاہتا ہے کہ اگر کوئی جابرانہ اور ظالمانہ (یا جدید اصطلاح میں استحصالی) نظام رائج ہو جائے تو اس کے نتیجے میں آبادی کی ایک عظیم اکثریت بالکل حیوانوں کی سطح پر زندگی بسر کرنا شروع کر دیتی ہے اور اس کے لیے کسی اعلیٰ سوچ' فکر یا خیال کا امکان ہی باقی نہیں رہتا' اور اکثریت کو مجبور کر دیا جاتا ہے کہ وہ کولہو کے بیل اور بار برداری کے اونٹ کی مانند اپنی دو وقت کی روٹی کے لیے جان گسل محنت میں صبح سے شام تک مصروف رہے' تو کہاں اللہ سے محبت کرنا' اُس کو چاہنا' اُس سے لو لگا کر بیٹھنا یا کسی اعلیٰ فکر کی طرف متوجہ ہونا![1] گویا اب انسانوں کے لیے اس مقصد کو پورا کرنا ممکن ہی نہیں رہتا کہ جس کے لیے ان کی تخلیق ہوئی تھی۔ بجوائے الفاظِ قرآنی: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿٥٦﴾﴾ (الذاریات) کہ میں نے جِنّوں اور انسانوں کو صرف اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔

لہٰذا اسلام یہ چاہتا ہے کہ نظامِ عدل وقسط قائم ہو' تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو موقع حاصل ہو کہ اللہ کی معرفت حاصل کریں' اُس سے محبت کریں اور اُس سے لو لگائیں۔

ان دو مقدمات کے بعد اب میں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔

---

(۱) ؏ ''تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے!''

اسلام کے دو معاشی نظام

حضرات! اسلام نے معاشی اور اقتصادی معاملات میں عدل وقسط کا جو مقام متعین کیا ہے اور جس میں اُس نے مساوات اور آزادی ایسی دونوں اعلیٰ اقدار کو خوبصورتی سے سمویا ہے وہ نظام کیا ہے؟(۱) میں اس کی طرف آتے ہوئے ایک بات کہنا چاہتا ہوں جو شاید اکثر لوگوں کو چونکا دے اور یہی میں چاہتا ہوں کہ ذہن بیدار ہو جائیں۔ وہ یہ کہ اسلام کا معاشی نظام ایک نہیں' دو ہیں۔ دونوں اپنی اپنی جگہ از ابتدا تا انتہا مکمل ہیں۔ دونوں کا اپنا ایک فلسفہ ہے' دونوں کا ایک نظریۂ ملکیت ہے' نظریۂ حقوق' نظریۂ قدرِ زائد (surplus value) ہے۔ یہ تمام چیزیں وہ ہیں کہ جو کسی بھی معاشی نظام میں بنیادی اہمیت کی حامل ہوا کرتی ہیں' اور یہ سب چیزیں ان دونوں میں بالکل جدا جدا ہیں۔ کوئی چاہے تو یوں کہہ لے کہ یہ دونوں ایک ہی نظام کے دو رُخ ہیں۔ لیکن بہرحال ان کے علیحدہ وجود سے انکار ممکن نہیں۔ یہ دونوں نظام باہم ایک دوسرے سے مربوط (inter-connected) بھی ہیں' بہت حد تک ایک دوسرے پر منحصر (interdependent) بھی' اور اسلام کی برکات اور اس کے ثمرات کا کامل ظہور ان دونوں کے اجتماع اور اتصال ہی سے ہو سکتا ہے۔ اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اگر ان دونوں میں سے ایک پہلو نگاہوں سے اوجھل ہو جائے اور توجہ صرف ایک ہی پر مرتکز ہو جائے تو اس سے جو تصویر سامنے آئے گی وہ اصل حقیقت سے بہت دُور ہوگی۔

ان میں سے ایک اسلام کا رُوحانی واخلاقی نظام ہے اور دُوسرا قانونی وفقہی نظام۔ ان دونوں کے تقاضے بسا اوقات مختلف ہی نہیں متضاد ہوتے ہیں۔ تاہم ان دونوں کے امتزاج سے اسلام کا کامل نظام وجود میں آتا ہے۔ آپ چاہیں تو ان دونوں پہلوؤں کو

---

(۱) ایک اہم بات یہ پیش نظر رہے کہ قرآن وحدیث میں نظام اسلامی یا نظام مصطفیٰ ﷺ کی اصطلاح ہمیں نہیں ملتی۔ اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے اور وہ یہ کہ نظام کوئی جامد شے نہیں بلکہ ہر دور کی علمی اور معاشرتی سطح کے مطابق نظام وجود میں آتا ہے۔ اس سلسلے میں اسلام کی رہنمائی ''ہدایات'' اور ''حدود'' کی صورت میں ہے۔ اسلام نے ''حلال اور حرام'' کی کچھ حدود متعین کی ہیں جن کی جمع وتدوین سے ''نظام'' وجود میں آتا ہے۔

''دعویٰ'' (thesis) اور ''جوابِ دعویٰ'' (anti-thesis) سے تعبیر فرمائیں اور ان دونوں کے امتزاج کو synthesis قرار دے لیں۔ ایک چھوٹی اور سادہ سی مثال سے بات واضح ہو جائے گی۔ کوئی شخص آپ کو ایک تھپڑ مار دے تو اگر آپ بالکل عاجز و کمزور ہیں تو اس صورت میں ''قہرِ درویش بر جانِ درویش'' کے سوا اور کوئی صورت قابل عمل ہے ہی نہیں۔ اس کے برعکس اگر آپ بدلہ لینے پر قادر ہیں تو آپ کے سامنے دو راستے کھلے ہیں: ایک یہ کہ آپ بدلہ لے لیں اور دوسرے یہ کہ آپ معاف کر دیں۔ اس صورت میں ایک جانب اسلام کا قانونی اور فقہی نظام بدلے اور قصاص کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم فرماتا ہے: ﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ (البقرۃ) ''اور اے ہوش مندو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے' تاکہ تم بچ سکو''۔ لیکن دوسری طرف اسلام کا اخلاقی اور روحانی نظام ہے جو عفو و درگزر کی تلقین کرتا ہے۔ یعنی اگر معاف کر دو تو یہ تقویٰ اور خدا ترسی سے قریب تر ہے۔ چنانچہ شوق اور رغبت دلانے کے انداز میں فرمایا جاتا ہے: ﴿وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ﴾ (آل عمران: ۱۳۴) یعنی وہ لوگ جو غصہ کو پی جائیں اور لوگوں کو معاف کر دیا کریں۔ دیکھ لیجیے کہ عفو و قصاص ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں' لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ انسانی معاشرہ ان دونوں میں سے صرف ایک پر استوار ہو سکتا ہے۔ دونوں اپنے اپنے مقام پر لازم و ناگزیر ہیں اور حسنِ معاشرت ان دونوں کے امتزاج ہی سے وجود میں آتا ہے۔

اس پر قیاس کر کے سمجھ لیجیے کہ اسلام کے معاشی نظام کے بھی دو پہلو ہیں۔ چنانچہ ایک جانب قانونی اور فقہی نظامِ معیشت ہے جس کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ ایک نوع کی محدود سرمایہ داری (Controlled Capitalism) ہے' اس لیے کہ اس میں انفرادی سرمایہ کاری کی اجازت موجود ہے۔ اگرچہ اسے ''سرمایہ دارانہ نظام'' بننے سے بعض تحدیدی اقدامات نے روک دیا ہے۔ دُوسری طرف اسلام کا روحانی و اخلاقی نظامِ معیشت ہے جس کے بارے میں میں پورے انشراحِ صدر سے عرض کرتا ہوں کہ وہ ایک نہایت اعلیٰ قسم کی روحانی اشتراکیت (Spiritual Socialism) ہے اور ایک

ایسا کامل سوشلزم ہے کہ اس کے آگے کا تصور بھی ممکن نہیں۔ اس لیے کہ سوشلزم یا کمیونزم میں تو پھر بھی انسانی ملکیت کا اثبات موجود ہے' اگرچہ انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی' لیکن اسلام اپنی اخلاقی و روحانی اور صحیح تر الفاظ میں ''ایمانی تعلیم'' کی رُو سے انسانی ملکیت کی کُلّی نفی کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں بار بار یہ الفاظ آتے ہیں: ﴿لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ﴾ یعنی آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اس سب کا مالک صرف اللہ ہے۔ انسان کسی اور شے کا مالک تو کیا ہوگا' خواہ وہ زمین ہو' مکان ہو' ساز و سامان ہو' روپیہ پیسہ ہو' وہ تو خود اپنا اور اپنے وجود کا مالک بھی نہیں۔ اُس کے ہاتھ پاؤں' اعضاء و جوارح اور جسم و جان اور اس کی کُل توانائیاں سب اللہ کی ملکیت ہیں' اور وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہے کہ میں ان کا امین ہوں۔ بقول شیخ سعدیؒ ؎

ایں امانت چند روزہ نزدِ ماست　　　　در حقیقت مالکِ ہر شے خداست!

یا بقول علامہ اقبال مرحوم

رزقِ خود را از زمیں بردن رواست　　　　ایں متاعِ بندہ و ملکِ خداست

اس اعتبار سے بھی ہمارے ہاں بڑی کنفیوژن پائی جاتی ہے۔ سوشلسٹ ذہن رکھنے والے اہل قلم ایسی آیات اور احادیث کو اکٹھا کر کے ہر شے کی ملکیت کی کامل نفی کرتے چلے ہیں اور ضرورت سے زائد اپنے پاس رکھنے کی بھی' کہ جب ''قُلِ الۡعَفۡوَ''(۱) فرما دیا گیا تو زائد چیز جبراً بھی وصول کر لی جائے گی۔ اس طرح وہ ایک کامل اسلامی سوشلزم کا نقشہ پیش کرتے ہیں' جب کہ وہ دوسرے پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ حالانکہ قانونِ وراثت بھی اسی قرآن میں موجود ہے' اور حضور اکرم ﷺ نے جو نظام برپا کیا تھا اس میں کہیں جبری مساوات دکھائی نہیں دیتی' بلکہ اس کے برعکس آزاد معیشت کے مواقع دیے گئے تھے کہ محنت کرو اور جائز ذرائع سے کماؤ' اور ان ذرائع سے تم جو کچھ کماؤ گے اس پر تمہارا حق تصرف (جو بہت قریب ہو جاتا ہے حق ملکیت کے) یہاں تک تسلیم کیا جائے گا کہ اس کو وراثتاً منتقل بھی کیا جا سکے۔ دوسری طرف ہمارے ہاں بعض مفکرین اور

---

(۱) یعنی جتنا ضرورت سے زائد ہے اللہ کی راہ میں دے ڈالو۔ (البقرۃ:۲۱۹)

اصحابِ قلم نے صرف اس قانونی نظام کو اتنا نمایاں کیا ہے کہ دوسرا پہلو دب گیا ہے، یعنی ''قُلِ الْعَفْوَ'' کی آیت ان کی تقریر و تحریر میں نہیں آتی۔

یاد رہے کہ یہ کنفیوژن (الجھن) پورے خلوص کے ساتھ محض غلط فہمی کی بنیاد پر بھی ہو سکتی ہے۔ اس وضاحت کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ یہ غلط فہمی ہمارے دورِ اوّل یعنی خلافت راشدہ کے دوران بھی پیدا ہو گئی تھی، مثلاً حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے غلبۂ زہد کے باعث یہ رائے قائم کی کہ ضرورت سے زائد اشیائے صرف اور کسی بھی مقدار میں سونا اور چاندی اپنے پاس رکھنے کی اجازت نہیں۔ آپؓ نے آیۂ کنز(۱) کو بالکل اس کے ظاہری الفاظ پر محمول کیا۔ خلافتِ راشدہ کے اس نظام میں جس پر تمام امت جمع تھی اس رائے کو ایک انتہائی موقف قرار دیا گیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں انہیں مدینہ منورہ سے باہر چلے جانے کی ہدایت بھی کی گئی۔ ایک بیابان میں انہوں نے جھونپڑا ڈالا اور وہیں ان کا انتقال ہوا(۲)۔ یہ نظامِ اسلامی کا وہ رُوحانی پہلو ہے جس کی طرف اسلام انسانوں کو ترغیب دینا چاہتا ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جس کے ذریعے انسان اپنے تزکیہ اور رُوحانی مراتب کے حصول کے لیے آگے بڑھ سکتا ہے۔ اسلام کے ساتھ ایمان بھی ہے، اور اس سے اوپر احسان کا درجہ بھی ہے،(۳) مگر اس کو قانونی درجہ دے دینا

---

(۱) ﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٣٤﴾﴾ (التوبۃ)

''اور وہ لوگ جو جمع کرتے ہیں اپنے پاس سونا اور چاندی اور خرچ نہیں کرتے اس کو اللہ کی راہ میں، تو ان کو بشارت دے دیجیے دردناک عذاب کی۔''

(۲) حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے احساس کا یہ عالم تھا کہ وفات کے وقت آپؓ نے زوجہ محترمہ سے فرمایا کہ تم نے یہ کیا سانپ اور بچھو اپنے گرد جمع کر لیے ہیں! تو انہوں نے کہا کہ کہاں ہیں وہ سانپ اور بچھو؟ تو آپ نے معمولی چیزوں جیسے توا، چمٹا اور دیگچی کا حوالہ دے کر کہا یہ نہیں پڑے ہوئے میرے گرد؟ حضرت ابوذرؓ کے اسی غلبۂ زہد کی وجہ سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ تم میں سے جو چاہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زہد اپنی آنکھوں سے دیکھے تو اسے چاہیے کہ وہ میرے ساتھی ابوذر کو دیکھ لے۔

(۳) حدیث جبریل و سورۃ المائدۃ: ۹۳

ایک مغالطہ تھا جو حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو پورے خلوص اور اخلاص کے ساتھ لاحق ہوا۔ لیکن آج یہ مغالطہ جان بوجھ کر اور بدنیتی کے ساتھ دیا جا رہا ہے' کیونکہ آج تو خلافت راشدہ کا نظام پورے کا پورا ہمارے سامنے موجود ہے اور اُمت کے اس اجتماعی فیصلے کو نظر انداز کرنا بغیر بدنیتی کے ممکن ہی نہیں۔

رُوحانی نظام کے چار اصول

اس روحانی معاشی نظام کے چار اصول ذہن میں پھر مرتب کر لیجیے۔

(۱) انسانی ملکیت کی کُلّی نفی۔

(۲) انسان کو اس دنیا میں جو کچھ ملتا ہے اس کی کمائی نہیں اللہ کا فضل ہے۔ گو دکان پر وہ بیٹھا ہے' کھیت میں ہل اُس نے چلایا ہے' محنت اُس نے کی ہے' لیکن ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ جو کچھ ملا ہے اس کو اللہ کا عطیہ اور اُس کا فضل سمجھے۔ اگر اسے اپنی محنت کا ثمرہ سمجھو گے تو اس پر اپنا حق ملکیت جتاؤ گے' لیکن اگر اللہ کا فضل سمجھو گے تو اس میں سے اپنا حق اسی قدر سمجھو گے جس قدر اللہ نے معیّن کیا ہے۔

(۳) انسان کا جائز حق کیا ہے؟ صرف اس کی ضروریات کے بقدر۔ ان کو بھی بعض احادیث میں متعین کر دیا گیا ہے۔

ا: اگر دو وقت کھانے کے لیے مل گیا ہے۔

ب: سر چھپانے کے لیے اگر کوئی چھت موجود ہے۔

ج: پہننے کے لیے اگر دو جوڑے کپڑوں کے موجود ہیں۔

د: اور اپنے کردار' اخلاق اور عفت کی حفاظت کے لیے اگر ایک بیوی مل گئی ہے۔

تو تمہارا بنیادی حق تمہیں مل گیا' اور اس سے زائد جو کچھ ہے وہ تمہارا نہیں دوسروں کا حق ہے۔ اس کو پہنچا دو اُن تک کہ جن کے پاس نہیں ہے اور پھر سمجھو کہ تم غریبوں کی اس امانت کے بوجھ سے سبکدوش ہو گئے کہ جو امتحان کی غرض سے تمہارے مال میں شامل کر دی گئی تھی' اور یہی ہے درحقیقت وہ مقام جہاں تک ''قُلِ الْعَفْوَ'' کا سارا فلسفہ پہنچانا چاہتا ہے کہ تمہارے پاس جو بھی ''قدرِ زائد'' ہے اس کو مزید کمائی کا ذریعہ نہ بناؤ۔

ضرورت پوری ہوگئی تو تمہارا حق مکمل ہوگیا' اب جو زائد تمہارے پاس ہے وہ خواہ قانوناً تمہارا ہے مگر حقیقتاً تمہارا نہیں ہے۔

گویا یہ ایک مکمل نظام ہے' اس میں ملکیت اور قدر زائد اور یہاں تک کہ اس قدرِ زائد کا مصرف بھی طے شدہ ہے۔ اس سلسلے میں سورۃ الروم کی ایک آیۂ مبارکہ ملاحظہ ہو' جس میں ربا (سود) کا ذکر بمقابلہ صدقات آیا ہے۔ فرمایا:

﴿وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۠ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ﴿٣٩﴾﴾ (الروم)

''اور جو تم سود دیتے ہو کہ لوگوں کے مال میں افزائش ہو تو اللہ کے نزدیک اس میں افزائش نہیں ہوتی' اور جو تم زکوٰۃ دیتے ہو اور اس سے اللہ تعالیٰ کی رضامندی طلب کرتے ہو تو (وہ موجبِ برکت ہے اور) ایسے ہی لوگ (اپنے مال کو) دوچند' سہ چند کرنے والے ہیں۔''

گویا دین کی رُوحانی تعلیم کے اعتبار سے ربا درحقیقت صدقہ اور خیرات کے بالمقابل ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص ملازم ہے' اس کو تنخواہ ملتی ہے جس سے اس کی ضروریات پوری ہو رہی ہیں اور کچھ سرمایہ اُس کے پاس جمع ہو گیا ہے۔ اس فاضل سرمایہ کے دو مصرف ہیں' ایک تو یہ کہ اس کو کسی اور کے کاروبار میں لگا کر اس کی محنت کے بل بوتے پر اس سرمایہ کو بڑھائے (وہ خود تو محنت نہیں کرے گا کیونکہ وہ تو کسی اور جگہ ملازم ہے) یہ بھی درحقیقت اس رُوحانی سطح پر ربا ہی قرار پائے گا' کیونکہ اس روحانی اور اخلاقی سطح پر اس فاضل سرمائے کا مصرف صرف ایک ہے کہ اس کا مالک محتاجوں اور غریبوں کو بنا دیا جائے۔ یہ ان کو دے دیا جائے کہ جو محروم ہیں یا جن کے پاس کاروبار کے لیے بنیادی سرمایہ موجود نہیں ہے۔ گویا فاضل سرمائے کو مزید آمدنی کا ذریعہ بنانا قانونی سطح پر جائز ہے' مگر روحانی اور اخلاقی تعلیم میں یہ چیز ممنوعات کی فہرست میں داخل ہے۔

قانونی اور فقہی نظام

حضرات! جیسا کہ عرض کیا ہے' اسلام کا قانونی اور فقہی نظامِ معیشت ایک طرح

کے ''کنٹرولڈ کیپٹلزم'' سے مشابہ ہے۔ اس میں تمام فطری تقاضوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس کی رُو سے انسان کو اپنے مال پر حق تصرف حاصل ہے۔ عام حالات میں صرف زکوٰۃ کی حد تک اس سے جبراً وصول کیا جائے گا[1]' باقی اگر وہ شوق سے چاہے تو اللہ کے راستے میں خرچ کرے اور خیر کمائے۔ لیکن اس کو اس بات کا قانونی حق حاصل رہے گا کہ اپنی ضرورت سے زائد مال کو کاروبار میں لگائے اور اس کو وراثتاً منتقل بھی کرے۔ یہ تمام چیزیں وہ ہیں کہ جو کسی سرمایہ دارانہ نظام میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن یہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اسلام نے اس قانونی نظام کو بھی ایک حد کے اندر رکھا ہے تاکہ یہ آزاد سرمایہ کاری' سرمایہ داری کی لعنت کی صورت اختیار کر کے انسانی معاشرے پر مسلط نہ ہونے پائے۔ اس ضمن میں اسلام نے جو عملی تدابیر اختیار کی ہیں ان کو ان کے فلسفیانہ پس منظر سمیت دو حصوں میں سمجھا جا سکتا ہے۔

(ا: یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ جب آزادی (خواہ وہ تھوڑی ہی کیوں نہ ہو) دی جائے گی تو کچھ اُونچ نیچ لازماً پیدا ہوگی۔ دوڑ لگے گی تو یقیناً کچھ لوگ آگے نکل جائیں گے اور کچھ پیچھے رہ جائیں گے۔ آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے اس فرق و تفاوت سے بچنا ممکن نہیں۔ آزادی خواہ کتنی ہی محدود کیوں نہ ہو' جب بھی آئے گی اس بات کا امکان بہرحال موجود رہے گا۔ چنانچہ اس کو کھلے دل سے تسلیم کرنا ضروری ہے۔ لیکن اسلام کے قانونی نظامِ معیشت میں اس بات کا اہتمام بھی کیا گیا ہے کہ معاشرے میں مالی فرق و تفاوت کو کم کیا جائے۔ اس کے لیے اسلام نے زکوٰۃ کا نظام قائم کیا ہے۔ اسلام نے ایک حد قائم کی ہے کہ جو لوگ اس سے اُدھر نکل جائیں ''دینے والے'' یا donors ہیں اور اِدھر والے ''لینے والے'' یا recipients ہیں۔ اُن کو haves شمار کر لیجیے اور اِن کو have-nots دین کی اصطلاح میں وہ علی الترتیب ''صاحبِ نصاب'' اور ''مسکین'' کہلاتے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ تقسیم بھی الل ٹپ (arbitrary) نہیں ہے۔ اسے آپ اپنے اختیار سے آگے پیچھے نہیں کر سکتے۔ یہ ایک لائن ہے جو کھینچی جا چکی ہے' جس کے پاس اتنے اونٹ ہیں

(ا) اس میں خاص حالات میں استثناء ممکن ہے' جس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔

اِدھر اور جس کے پاس نہیں ہیں اُدھر۔ اگر اس قدر سونا ہے تو اِدھر اور نہیں ہے تو اُدھر۔ اور اسی طرح جس کے پاس اتنی چاندی ہے اِدھر اور جس کے پاس نہیں ہے اُدھر۔ اس تقسیم کے بعد وہ نظامِ زکوٰۃ قائم کیا گیا کہ جس کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے واضح فرمایا: ((تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِیَائِهِمْ وَتُرَدُّ عَلٰی فُقَرَاءِ هِمْ)) (متفق علیہ) ''ان کے اغنیاء سے مال وصول کیا جائے گا اور ان کے فقراء کو دے دیا جائے گا''۔ تاکہ معاشرے میں پیدا ہونے والی ناہمواری کا سدِ باب ہو۔ اور ایسا نہ ہو کہ کچھ لوگ بھوکے اور ننگے رہ جائیں اور ان کی بنیادی ضرورتیں بھی پوری نہ ہوں' جبکہ کچھ لوگ اتنا سرمایہ جمع کرلیں کہ کیفیت وہ ہو جائے جس کے بارے میں سورۃ الحشر میں بایں الفاظ متنبہ فرمایا گیا ہے: ﴿کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَةً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ﴾ (آیت ۷) کہ سرمایہ صرف تم میں سے صاحبِ ثروت لوگوں کے درمیان ہی گردش میں نہ رہ جائے۔ جس کی ایک سادہ مثال ایک کروڑ پتی کی بیٹی کا لاکھوں روپے کا جہیز لے کر دوسرے کروڑ پتی کے گھر جانا اور کسی امیر کے بیٹے کی سالگرہ پر اُمراء کا لاکھوں روپے کے تحائف کا انبار لگانا ہے۔ اس میں بظاہر سرمایہ گھومتا ہے مگر صرف اغنیاء کے دائرے میں۔ یہ معاشی چکی صرف وہیں گھوم رہی ہے اور اس کا آٹا چھلنی سے چھن کر نچلے طبقوں تک نہیں پہنچ رہا۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ کسی معاشرے میں یا کسی ملک میں جو بھی ذرائع پیداوار اللہ نے تخلیق فرمائے ہیں ان سے جو کچھ بھی حاصل ہو اس کی ایک منصفانہ تقسیم ہو۔ معاشرے کے تمام افراد پیداوارِ دولت سے متمتع ہوں اور گردشِ دولت صرف بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ کا مصداق نہ بنے۔

میں جس مفہوم کی ادائیگی کے لیے ''کنٹرولڈ کیپٹلزم'' کی اصطلاح استعمال کر رہا ہوں آج کل اس مفہوم کو internally managed capitalism کے الفاظ سے ادا کیا جا رہا ہے۔ سرمایہ دار بھی اب اس بات کو جان چکے ہیں کہ ننگے اور عریاں کیپٹلزم کا کوئی مستقبل نہیں' وہ تباہی اور بربادی کی طرف جا رہا ہے۔ بقول علامہ اقبال مرحوم۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہو گا!

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا!

لہٰذا خود کیپٹلزم اپنے اندر کچھ نمایاں تبدیلیاں کر رہا ہے۔ اس کی بہت نمایاں مثال آپ کو برٹش سسٹم میں ملے گی۔ مثلاً جو لوگ کام پر نہیں ہیں ان کو نان ایمپلائمنٹ الاؤنس دیا جائے یا ہر شہری کی بنیادی ضروریات کی کفالت ریاست اپنے ذمے لے۔ چنانچہ آزاد معیشت بھی ہے کہ جو آگے نکل سکتے ہیں نکلیں' لیکن ہر شہری کے لیے اس کی بنیادی ضروریات کی فراہمی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ غور کیجیے کہ اسلام کے نظام میں یہ چیزیں چودہ سو سال پہلے آ چکی تھیں۔ اس ذمہ داری کا اندازہ حضرت عمرؓ کے اس تاریخی جملے سے لگایا جا سکتا ہے جس میں آپؓ نے فرمایا کہ ''اگر دجلہ اور فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا تو عمر سے اس کے بارے میں بھی باز پرس ہوگی''۔ (انسان تو بہر حال اشرف المخلوقات ہے' اس کا حق جانوروں سے مقدم ہے۔) اسلام آزادی دیتا ہے کہ کماؤ اور کھاؤ' جائز حدود کے اندر اندر خوب محنت کرو۔ کوئی آگے بڑھ جائے اور کوئی پیچھے۔ لیکن یہ معاملہ ایک حد کے اندر اندر رہے' اور جو پیچھے رہ جائیں ان کی بنیادی ضروریات کی ضمانت کے لیے زکوٰۃ اور عُشر کا نظام قائم کیا گیا۔ کوئی چاہے تو اس کو اجتماعی انشورنس کا نام دے لے۔ اگرچہ اس میں ایک فرق ہے۔ انشورنس کسی بھی نوعیت کی ہو اس کو انسان اپنی کمائی میں سے خرچ کر کے کماتا ہے جبکہ زکوٰۃ اور عشر کے ذریعے سے جو انشورنس اسلام فراہم کرتا ہے اس میں مستفید (beneficiary) کا کوئی contribution نہیں ہے' اس کے ادا کرنے والے صرف اغنیاء ہیں۔

ب: اسلام نے مساکین اور صاحب نصاب لوگوں کے مابین فرق و تفاوت کو کم کرنے کے لیے صرف زکوٰۃ کے نظام پر ہی اکتفا نہیں کیا' بلکہ اس آزاد سرمایہ کاری پر حلال و حرام کی وہ حدود و قیود قائم کی ہیں کہ جن کی موجودگی میں واقعتاً سرمایہ کاری ''سرمایہ داری'' نہیں بن سکتی۔ ذرا نگاہ ڈالیے ان اقدامات پر اور قرآن مجید کی حکمت بالغہ پر عش عش کیجیے کہ بغیر معاشیات کا کوئی عنوان قائم کیے کیسی بنیادی اور اہم ہدایات دی ہیں۔

دُنیا میں ہمیشہ سرمایہ اور محنت کے امتزاج ہی سے معاشی نتیجہ نکلتا ہے۔ ایک چھوٹا سا خوانچہ بھی اگر آپ لگائیں تو آپ کو سو دو سو روپے کا مال لگا کر بیٹھنا ہوگا۔ یہی حال بڑی دکان کا ہے۔ یہاں تک کہ کارخانہ اور مل بھی جو کچھ پیدا کرتے ہیں سرمایہ اور محنت کے امتزاج ہی سے پیدا کرتے ہیں۔ گو جدید ماہرین اقتصادیات خصوصاً سوشلسٹ مصنّفین نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ سرمایہ بھی محنت ہی کی پیداوار ہے' لیکن یہ بحث درحقیقت مرغی اور انڈے کی نوعیت کی ہے کہ ان میں سے کون سی شے پہلے ہے۔

بہرحال یہ امر مسلّم ہے کہ اسلام کے نظامِ معیشت میں زیادہ زور محنت پر ہے اور اسے زیادہ سے زیادہ تحفظ دیا گیا ہے' جب کہ سرمائے کی حیثیت کم سے کم رکھی گئی ہے اور اس کے صرف اپنی ذاتی حیثیت میں earning agent ہونے کو کم سے کم تسلیم کیا گیا ہے — اور اس کی بدترین صورت کہ:

(۱) سرمایہ صرف سرمایہ ہونے کی حیثیت سے کمائی کا حق دار ہو۔

(۲) وہ اپنا تحفظ بھی چاہے۔

(۳) گھاٹے میں شریک نہ ہو۔

(۴) اور نفع میں بھی ایک معین شرح لے رہا ہو۔

یہ چار عناصرِ سود یا ربا کے جزوِ لاینفک ہیں' جسے اسلام نے حرامِ مطلق قرار دیا ہے۔ اس لعنت کو جس طرح اسلام نے اپنے نظامِ معیشت میں ختم کیا ہے اور جس طرح اس کی جڑ کاٹی ہے اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ قرآن مجید میں شراب اور بدکاری کے ارتکاب جیسے جرائم پر بھی وہ انداز اختیار نہیں فرمایا گیا جو سود پر کیا گیا ہے۔ کوئی شخص اگر جذبات کی رَو میں بہہ کر کوئی غلطی کر بیٹھا ہے تو اُس پر حد تو جاری کی جائے گی' لیکن قرآن مجید میں اللہ کا جو غضب اور غصہ سودی کاروبار کرنے والوں پر بھڑکا ہے کسی اور پر نہیں بھڑکا۔ فرمایا کہ اگر تم سود کے لین دین سے باز نہیں آتے ﴿فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ﴾ (البقرۃ:۲۷۹) تو سن لو کہ اللہ اور اس کے رسول کا تمہارے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ اور حدیث میں تو واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے سب سے بڑے رمز شناس حضرت

محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے جو انداز اختیار کیا ہے وہ ہماری ذہنی سطح سے قریب تر ہے۔
آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اَلرِّبَا سَبْعُوْنَ حُوْبًا اَیْسَرُھَا اَنْ یَّنْکِحَ الرَّجُلُ اُمَّہٗ)) (رواہ ابن ماجہ والبیہقی) ''ربا (سود) کے ستر اجزاء ہیں (یہ گناہ اتنا بڑا ہے کہ اس کے ستر حصے کیے جاسکتے ہیں) اور ان میں ہلکاترین بھی اس کے مساوی ہے کہ کوئی شخص اپنی ماں سے زنا کرے۔''

یہ انداز بظاہر کھلتا ہے کہ آپ ﷺ نے یہ اندازِ تعبیر کیوں اختیار فرمایا' لیکن جب میں نے غور کیا تو احساس ہوا کہ واقعہ یہ ہے کہ انسان کو بہت سے گناہوں سے طبعی نفرت ہے۔ خصوصاً ہمارے ہاں ایک نام نہاد ''دیندار'' مگر اصلاً ''کاروباری'' طبقہ ہے۔ ان لوگوں کو نماز روزے سے بڑی دلچسپی ہے۔ حج کرنا تو گویا ان کا محبوب مشغلہ ہے' اور دار العلوم اور مساجد بظاہر قائم ہی انہی کے بل بوتے پر ہیں۔ شراب سے ان کو بڑی نفرت ہے اور اگر اس پر زنا کا اضافہ ہو جائے تو گویا قیامت آگئی۔ مگر سود سے ان کو کوئی نفرت نہیں اور وہ بڑے ذوق وشوق سے سودی کاروبار کرتے ہیں۔ لہٰذا نبی اکرم ﷺ نے اس کو میزانِ عدل میں تول کر ایک نسبت وتناسب قائم فرمایا ہے اور واضح فرمادیا ہے کہ اس کی اصل حیثیت کیا ہے' یعنی معاشرتی برائی ہونے کے اعتبار سے یہ زنا کی بدترین صورت (یعنی ماں کے ساتھ زنا) سے بھی ستر گنا زیادہ بھیانک ہے۔

بالکل اسی نوعیت کا ہے وہ انداز جو سورۃ الحجرات میں غیبت کی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے غیبت کرنے کو اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف قرار دیا گیا ہے کہ جس طرح ایک مردہ اپنا دفاع نہیں کرسکتا' جیسے چاہو نوچ ڈالو' اسی طرح تمہارا جو بھائی موجود نہیں وہ بھی اپنی مدافعت سے قاصر ہے' جیسے چاہو اس کی برائی کرلو۔

فی الجملہ ہمارے نظامِ شریعت میں اور احکامِ دین کے اس پورے سلسلے میں جو بدترین برائی قرار دی گئی ہے وہ سود ہے۔ اصل میں یہی وہ چیز ہے جس پر سرمایہ داری پروان چڑھتی ہے اور ہمارے دین میں اس کی جڑ کاٹ دی گئی ہے۔

کاروبار کی وہ صورتیں جو مطلقاً حرام ہیں

سرمایہ جب اپنے بل بوتے پر مارکیٹ کو کنٹرول کرتا ہے اور مارکیٹ میں اتار چڑھاؤ پیدا کرتا ہے' مثلاً ایک شخص سرمایہ کی بنیاد پر کبھی ایک دم بہت سا مال خرید کر قیمتیں بڑھا دیتا ہے اور مارکیٹ کو اونچا لے جاتا ہے اور کبھی ایک دم بہت سا مال ریلیز (release) کر کے مارکیٹ کے بھاؤ گرا دیتا ہے تو یہ سرمائے کا کھیل بلکہ ننگا ناچ ہے۔ مارکیٹ میں اس کے جتنے بھی ذرائع ہیں ان کو دین اسلام نے حرام مطلق قرار دیا ہے۔ مثلاً:

(۱) ذخیرہ اندوزی (Hoarding)

اس سلسلے میں سب سے زیادہ زور خوردنی اشیاء (eatables) پر دیا گیا ہے' کیونکہ یہ انسان کی سب سے زیادہ بنیادی ضرورت ہیں۔ اس پر قیاس کیا جا سکتا ہے باقی اشیائے ضرورت کو بھی۔ آنحضرت ﷺ نے ذخیرہ اندوزی کے بارے میں ارشاد فرمایا:

((مَنِ احْتَكَرَ طَعَامًا اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً فَقَدْ بَرِئَ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَبَرِئَ اللّٰهُ تَعَالٰى مِنْهُ)) (مسند احمد)

''جس نے کھانے پینے کی چیز چالیس دن تک روکے رکھی (بازار میں مانگ ہے مگر وہ اس کو فراہم نہیں کر رہا' چاہتا ہے کہ قیمتیں بڑھ جائیں) تو وہ اللہ سے بری ہو گیا اور اللہ اُس سے بری ہو گیا۔ (اللہ کا کوئی تعلق اس سے نہیں اور اس کا کوئی تعلق اللہ سے نہیں۔)''

(۲) سٹہ (Speculation)

کچھ لوگوں کی ایک معاشی حیثیت متعیّن ہے اور وہ سٹہ کھیلتے ہیں اور بیٹھے بٹھائے مال کے خرید و فروخت کا چکر چلاتے رہتے ہیں' حالاں کہ وہ نہ بالفعل مال خریدتے ہیں اور نہ بیچتے ہیں اور نتیجتاً مارکیٹ میں آنے سے قبل ہی مال پر منافع کی تہیں چڑھتی چلی جاتی ہیں۔ یہ تمام پیشگی فرضی سودے سرمایہ داروں کا ایک کھیل ہیں' اس کے سوا کچھ نہیں۔ ہمارے دین میں جو مال موجود نہ ہو اس کا سودا نہیں ہو سکتا' سوائے ایک استثنائی صورت کے جسے ''بیع سَلَم'' کہا جاتا ہے۔

(۳) انشورنس (Insurance)

میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ مختلف چیزوں کی حقیقت کو سمجھیں۔ بقول علامہ اقبال۔

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا!

بعض چیزیں دیکھنے میں بہت خوش نما نظر آتی ہیں لیکن حقیقت میں وہ بھی اسی نوعیت کی ہیں کہ جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ انہی میں ایک انشورنس ہے۔ ہم کسی درجے میں یہ تو جانتے ہیں کہ ہمارے دین میں یہ شے حرام ہے۔ اس کی حرمت کی حکمت سمجھئے کہ اس حرمت سے کس طرح سرمایہ کاری (جس کی اسلام میں اجازت ہے) کو سرمایہ داری بننے سے روکا گیا ہے۔

انشورنس کیا ہے؟ اوّل تو اس میں چانس والا جوئے کا پہلو ہے‘ لیکن اس سے پہلے اس کی اصلیت ہی سرمایہ دارانہ ہے۔ اصل انشورنس تو وہ ہے جو بڑی بڑی فیکٹریوں اور کارخانوں کی ہوتی ہے۔[1] ایک سرمایہ دار نے دس لاکھ روپے کے سرمائے سے ایک کارخانہ بنایا‘ فرض کیجیے وہ ایک ماچس کی فیکٹری لگاتا ہے۔ اس کا یہ کارخانہ آفاتِ سماویہ کی زد میں ہے۔ ہوسکتا ہے کوئی سیلاب آجائے یا کسی اتفاقی حادثہ میں آگ لگ جائے اور سارا کارخانہ جل کر راکھ ہو جائے‘ لیکن وہ سرمایہ دار اپنے سرمائے کا تحفظ چاہتا ہے انشورنس کے ذریعے سے۔ لیکن وہ یہ تحفظ بھی اپنی جیب سے نہیں کرتا۔ اس کے لیے وہ جو پریمیم (premium) ادا کرتا ہے اس کو اپنے اخراجات میں داخل کر کے دیا سلائی کی لاگت (cost) میں شامل کرتا ہے اور دیا سلائی کی ڈبیہ کی قیمت اگر ۲۵ پیسے ہے تو اس میں ایک پیسہ یا کم وبیش وہ سرمایہ دار صارف (consumer) سے اپنے سرمائے کے تحفظ کے لیے وصول کر رہا ہے۔ یہ ذہن میں رہے کہ قومی معیشت کے اعتبار سے تباہی ہوگئی‘ ملکی سطح پر دس لاکھ روپے کا نقصان تو ہو گیا لیکن وہ سرمایہ دار اس قومی نقصان سے

---

(۱) لائف انشورنس کے حق میں بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔ اس میں سے جوئے کا پہلو نکال دیجیے تو وہ اتنی سخت چیز نہیں رہتی‘ لیکن حرمت کا پہلو بہرحال ہے۔ میں اس کا قائل ہوں۔

لاتعلق رہنا چاہتا ہے۔ وہ صارف کی کاسٹ پر اپنے سرمائے کا تحفظ کرتا ہے اور اپنے مستقبل کا بھی۔ وہ یہ تحفظ عوام کی جیبوں پر بوجھ ڈال کر کرتا ہے۔ یہ ہے اصل حقیقت انشورنس کی۔ گویا یہ فی الحقیقت سرمایہ داروں کی ایک کوآپریٹو ہے' اس کے سوا کچھ نہیں۔ یہ صرف سرمایہ داروں کے سرمائے کا تحفظ ہے اور ﴿كَیْ لَا یَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْكُمْ﴾ کی جیتی جاگتی تصویر۔ یہ سرمایہ داری کی لعنت کو تقویت پہنچانے والی شے ہے' جس کی حرمت کا اسلام نے فیصلہ صادر فرما دیا ہے۔

معیشت کی ناپسندیدہ یا مختلف فیہ صورتیں

اب تک تو میں نے وہ چیزیں بیان کی ہیں جو حرامِ قطعی ہیں۔ تھوڑا سا نیچے آیئے تو ہمارے دین میں ایک اور دائرہ ہے جس میں اسلام نے کچھ چیزوں کو یا تو حلال رکھا ہے یا یہ کہ ان کی حِلّت وحُرمت میں اختلاف ہے' لیکن رُوحِ دین کے اعتبار سے ناپسندیدہ ہیں۔ ان سب کو میں ایک ہی گروپ میں لا رہا ہوں۔

ا: مضاربت

ایک شخص محنت کر سکتا ہے' دکان چلا سکتا ہے' مگر اُس کے پاس سرمایہ نہیں ہے اور کسی دوسرے شخص کے پاس زائد سرمایہ موجود ہے۔ اب یہ دونوں مل کر کام کرتے ہیں' ایک کی محنت ہو گی دوسرے کا سرمایہ۔ اس صورت میں محنت اور سرمایہ کا امتزاج [1] وجود میں آئے گا اور اس کا نام مضاربت ہے۔ یہ دین میں جائز تو ہے مگر پسندیدہ نہیں' جیسے مثلاً طلاق۔ [2] اگر کسی کے پاس سرمایہ ہی اتنا ہے کہ جس پر خود اُس کی معیشت کا دار و مدار چل سکتا ہے تو وہ خود دکان لگائے' محنت کرے اور رزقِ حلال کمائے۔ لیکن اگر کسی

(۱) امتزاج کی ایک صورت مشارکت بھی ہے کہ دو آدمی مل کر کاروبار کرتے ہیں' دونوں سرمایہ بھی لگاتے ہیں اور دونوں محنت بھی کرتے ہیں' تو اس میں کوئی قباحت سرے سے ہے ہی نہیں۔

(۲) ((اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَى اللّٰهِ الطَّلَاقُ)) (رواہ ابو داؤد وابن ماجہ)
''جائز کاموں میں اللہ کے نزدیک سب سے ناپسندیدہ شے طلاق ہے۔''

شخص کے پاس اپنی ضروریات کے لیے کوئی اور ذریعہ موجود ہے اور وہ فاضل سرمایہ اپنے ایسے بھائی کو دے رہا ہے جو سرمایہ نہ ہونے کے باعث کسی اور کے سرمائے پر کام کرنے پر مجبور ہے' لیکن یہ اُس کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے سرمائے کی بنیاد پر اُس کی محنت میں حصے دار بنتا ہے تو یہ جائز تو ہے' کیونکہ اگر کسی بھی درجے میں آزادی کو برقرار رکھنا ہے تو اس نظام میں یہ گنجائش رکھنا پڑے گی۔ لیکن اسلام اس کو بس مجبوراً جائز قرار دیتا ہے' جبکہ اس کے نزدیک پسندیدہ چیز وہی ہے جس کا ذکر اخلاقی نظام کے تحت ''قُلِ الْعَفْوَ'' کے حوالے سے گزر چکا ہے۔ لیکن اس میں بھی دیکھئے کہ اسلام نے کس مضاربت کو جائز قرار دیا ہے۔ ہمارے ہاں جو مضاربتیں ہوتی ہیں ان پر قیاس نہ کیجیے۔ لفظ مضاربت کے اشتراک سے یہ نہ سمجھ لیجیے کہ اس نام سے جو کچھ ہے وہ جائز ہے۔ اسلام جس مضاربت کو جائز قرار دیتا ہے اس میں محنت کو پورا پورا تحفظ دیا گیا ہے' جبکہ سرمائے کو کوئی تحفظ نہیں دیا گیا۔ اگر نفع ہوگا تو محنت کرنے والے کو اس میں سے حصہ ملے گا' لیکن اگر گھاٹا ہوگا تو اس کا کوئی بوجھ محنت کش پر نہیں پڑے گا۔ نقصان کا سارا بوجھ سرمایہ دار کو برداشت کرنا ہوگا۔

یہاں ایک اور بات بھی یاد رکھیے۔ قرآن مجید میں جہاں تجارت کا ذکر آتا ہے وہاں ﴿عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ﴾ (النساء:۲۹) (کہ وہ تجارت باہمی رضا مندی سے ہو) کی شرط عائد کی گئی ہے۔ اگر آپ کوئی شے خریدنے بازار گئے ہیں' آپ کو اس کا بھاؤ معلوم ہے' آپ قیمت دے کر چیز خرید لیں گے اور معاملہ رضا و رغبت کا ہوگا' لہٰذا وہاں یہ شرط پوری ہو جائے گی۔ لیکن کوئی ایسا معاملہ جس میں کوئی شخص بالکل مجبور ہو' گو قانونی طور پر تو رضا مندی ہوگئی' آپ کہیں گے کہ میں نے کب اس کو مجبور کیا تھا وہ خود میرے پاس آیا ہے کہ میرے پاس سرمایہ نہیں ہے تم مجھے سرمایہ دو' میں محنت کرلوں گا اور تمہیں اس میں سے حصہ دوں گا۔ کہنے کو تو رضا مندی ہوگئی' لیکن درحقیقت یہ مجبوری ہے' کیونکہ اس کے پاس اپنا سرمایہ نہیں۔ اگر ہو تو کوئی کب پسند کرتا ہے کہ کسی اور کو اپنی محنت کے حاصل میں شریک کرے۔ چنانچہ مجبوری کا پہلو اس مضاربت میں موجود ہے جس کی وجہ سے اگرچہ یہ حلال تو ہے مگر پسندیدہ نہیں ہے۔

ب: مزارعت

اسی قبیل کی شے مزارعت ہے۔ ایک شخص کی زمین ہے اور کوئی دُوسرا اس پر محنت کر رہا ہے۔ اس مسئلہ میں فقہائے اُمت کے درمیان اختلاف ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہر قسم کی مزارعت حرامِ مطلق ہے۔ Absentee Landlordism کا ان کی رائے میں اسلام میں کوئی امکان سرے سے موجود نہیں۔ بعض دوسرے فقہاء نے ان احادیث پر غور کرنے کے بعد اس میں استحسان اور مصالح مرسلہ کے اصول کے تحت کچھ گنجائشیں نکالی ہیں' اور یہ بھی میں سمجھتا ہوں کہ چونکہ اُس دَور کے خاص حالات میں ایک موجود الوقت نظام کو کلیۃً بدلنا ممکن نہ تھا' لہٰذا کچھ ناگزیر شرائط کے ساتھ ان کی گنجائش پیدا کی گئی تھی' ورنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو مزارعت پر لفظ ربا کا اطلاق کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ ایک کھیتی کو سینچ رہے ہیں' جبکہ آپ کے علم میں تھا کہ رافع کی اپنی کوئی زمین نہیں' لہٰذا آپ نے ان سے دریافت فرمایا کہ کھیتی کس کی ہے اور زمین کس کی ہے؟ حضرت رافعؓ نے بتایا کہ کھیتی میری ہے' بیج میں نے ڈالا ہے اور محنت بھی میں نے کی ہے' جبکہ زمین بنی فلاں کی ہے' اور ہمارے مابین پیداوار نصف نصف تقسیم ہوگی۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''أَرْبَيْتُمَا'' یعنی تم نے ربا کا معاملہ کیا' ایک سودی کاروبار کیا۔ اور فرمایا کہ زمین اس کے مالک کو لوٹا دو اور تمہارا جو خرچ اس پر آیا ہے وہ اس سے وصول کرلو (سنن ابی داوٗد)۔ اس لیے کہ اس میں مالک کی محنت شامل نہیں ہو رہی ہے' وہ صرف زمین کی ملکیت کی بنیاد پر اپنے ایک بھائی کی گاڑھے پسینے کی کمائی میں سے حصہ وصول کرنا چاہتا ہے۔

ہمارے ہاں مزارعت کی جو شکلیں رائج ہیں ان میں پھر بھی مالک بیج اور بہت سی دوسری چیزوں میں شامل ہوتا ہے۔ یہ اس حرام کو حلال بنانے کے لیے کچھ اضافی شرائط عائد کی گئی ہیں' ورنہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ (1) کا فتویٰ آنکھیں کھول دینے کے قابل ہے۔ مجھے امام صاحب کی اس رائے سے کاملتاً اتفاق ہے۔

---

(1) یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ جب ہماری اکثریت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی فضیلت بیان کرتی ہے تو ان کو امام اعظم اور سید الفقہاء قرار دیتی ہے اور ان کے بعض فتاویٰ کو درست ثابت کرنے ◄

خرید و فروخت کے مروّجہ طریقوں پر قدغنیں

جو مال موجود نہ ہو اس کے سودے کی جو شکل بھی ہو' وہ حرام ہے' مثلاً:

(۱) ٹھیکے پر زمین دینا۔ مالک نے ایک وقفے کے لیے زمین کی قیمت وصول کر لی ہے۔ اب کاشت کار کو اس سے کوئی بچت ہوتی ہے یا نہیں' اس کو اس سے کوئی بحث نہیں۔ گویا یہ تو کھلی ہوئی سود کی صورت ہے' اس لیے یہ حرام ہے۔

(۲) باغ میں پھل آنے سے قبل اس کا سودا کرنا بھی ناجائز ہے۔

(۳) یہ تمام ایڈوانس بزنس (advance transactions) جو دنیا میں ہوتے ہیں ان کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔ سیدھی سادھی بیع وہ ہے کہ قیمت دو اور مال وصول کرو' یا ایک ہاتھ سے چیز لو اور دوسرے ہاتھ سے دو۔ تبادلے کی صورت میں یہاں بھی کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا مقصود نہ ہو۔ ذخیرہ اندوزی یا کوئی اور مفاد پیش نظر نہ ہو۔ ایڈوانس بزنس کے اس طریقے کے باعث over trading ہوتی ہے۔ ایک شخص کے پاس پانچ لاکھ روپے ہیں' لیکن وہ پچاس ہزار روپیہ بیعانہ ادا کر کے پچاس لاکھ کے سودے کر لیتا ہے تو اس سے سرمایہ داری کی لعنت جنم لیتی ہے۔ اس کو روکا گیا ہے کہ اگر تمہارے پاس پانچ لاکھ روپیہ ہے' تو پانچ لاکھ ہی کا سودا کرو۔ اسلام میں ادھار کی صرف ایک صورت جائز ہے جس کو بیعِ سَلم کہتے ہیں کہ ایک طرف سے پوری جنس یا قیمت ادا کر دی جائے اور دوسری طرف سے مال کی فراہمی یا ڈلیوری کو مؤخر (defer) کیا جا سکتا ہے۔ لیکن آج کل جزوی ادائیگی کے جتنے بھی سودے کیے جا رہے ہیں ان کی شریعت اسلامی میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

(۴) آڑھت

اسی کے ضمن میں آڑھت آتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((لَا یَبِعْ حَاضِرٌ لِبَادٍ)) (متفق علیہ) ''کوئی شہر کا آدمی باہر کے آدمی کا مال فروخت نہ کرے۔''

◄ کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا جاتا ہے۔ مگر ''میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھو'' کے مصداق ایسے اہم معاملات پر ان کے فتوے کو سرے سے کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔

یہ آڑھتی جو منڈیوں میں اڈے جما کر بیٹھے ہوئے ہیں اور وہ مال جو یہ بیچتے ہیں ان کا اپنا نہیں ہوتا' اور کئی دفعہ مال موجود بھی نہیں ہوتا' وہ صرف اپنے اڈے کی وجہ سے فروخت کنندہ اور گاہک دونوں سے کمیشن وصول کرتے ہیں۔ ایک شخص نے گندم بوئی ہے تو وہ خود فروخت کرے' اور اگر اس شہر والے کے پاس گندم کی قیمت موجود ہے تو پہلے پوری گندم خرید لے اور پھر اپنے پاس سے اسے فروخت کرے۔ اس اعتبار سے دیکھئے کہ یہ کس قدر دُوررَس ہدایت ہے جو نبی اکرم ﷺ نے دی ہے' ورنہ ہمارے ہاں اجناس کی قیمتوں کو بڑھانے والے اور گوشت کی قیمتوں کو چڑھانے والے یہی آڑھتی ہیں۔ لہٰذا اسلام نے ان کے عمل دخل کو کم کیا ہے۔

مڈل مین (MIDDLE-MAN): جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں' اسلام نے اپنے معاشی ڈھانچے میں ''مڈل مین'' کے عمل دخل کو حتی الوسع کم کیا ہے۔

تقسیم دولت کے لیے اقدامات

(۱) **وراثت** : اسلام کا قانونِ وراثت ارتکازِ دولت کو ختم کرتا ہے۔ ایک شخص کی جائیداد کا وارث کوئی دوسرا ایک ہی شخص نہیں بنتا بلکہ وہ جائیداد اور سرمایہ بٹ کر بہت سے لوگوں کو ملتا ہے۔

(۲) انفاق فی سبیل اللہ اور نفلی صدقات۔

انسانی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر دولت کمانا

جس طرح اسلام دولت کمانے کے لیے کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں دیتا بالکل اسی طرح انسانی کمزوریوں کو مشتعل (exploit) کر کے دولت کمانے کی بھی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مثلاً:

(۱) جنسی جذبہ (sex): جنسی جذبہ انسان کی بہت بڑی کمزوری ہے۔ قرآن مجید نے انسانی شرمگاہ کو ''فرج'' کہا ہے۔ فرج کے معنی ہیں اندیشے کی جگہ۔ فصیل میں جہاں دراڑ ہے وہ فرج ہے' جہاں سے غنیم کے در آنے کا یعنی حملہ آور کے اندر داخل

ہونے کا موقع ہو۔ لہٰذا انسان کے اس جنسی جذبہ کو مشتعل کر کے پیسہ کمانے کو حرامِ مطلق قرار دیا گیا ہے۔ اس طرح ساری فلم انڈسٹری' قحبہ گری کا کاروبار اور فحش لٹریچر کی طباعت واشاعت اور خرید وفروخت کا دھندا ختم ہو جاتا ہے۔

(۲) شراب پر پابندی: اسی طرح شراب بھی حیوانی جذبات کو مشتعل کرتی ہے' چنانچہ اس کے بنانے' کشید کرنے' پینے پلانے اور خریدنے اور بیچنے کو حرامِ مطلق قرار دیا گیا ہے۔

(۳) فضول خرچی: انسان اکثر و بیشتر دولت کماتا ہے تعیش کے لیے' لیکن اسلام میں عیاشی کے تمام دروازے بند ہیں۔ قرآن مجید میں تبذیر (فضول خرچی اور نمود و نمائش پر خرچ کرنے) سے روکا گیا ہے اور اس کے مرتکب افراد کو شیطان کے بھائی قرار دیا گیا ہے۔ گویا اس طریقے سے بھی اسلام نے دولت کے ساتھ انسان کی محبت (attachment) کو کم کر دیا ہے۔ تو پھر کوئی شخص سرمائے کو کیوں چاہے گا؟

قصہ مختصر' سرمایہ داری کی لعنت پر اسلام کا حملہ کسی ایک جانب سے نہیں بلکہ مختلف اطراف سے ہے۔

تو یہ ہے وہ نقطۂ عدل' کہ آزادی بھی برقرار رہے' یعنی اسلام میں جبری مساوات نہیں' لیکن اس بات کا معقول انتظام ہے کہ عوام کے درمیان معاشی ناہمواری ایک حد سے بڑھنے نہ پائے۔ رہی وہ جبری اور کُلّی مساوات جس کی تعلیم سوشلزم دیتا ہے تو وہ دُنیا میں آج تک کبھی قائم نہیں ہوئی۔ اور فطرتِ انسانی سے بالکل بعید ہے۔

دو گنجائشیں

(۱) ٹیکسز کی وصولی: ایک طرف اسلام نے اس بات کی گنجائش رکھی ہے کہ اگر کسی وقت زکوٰۃ اور عشر کی حاصل شدہ آمدنی یا خمس اور اس نوعیت کے دوسرے محصولات مثلاً فے وغیرہ سے حاصل شدہ رقوم [1] ایمرجنسی کے حالات میں کفالتِ عامہ کے لیے کافی نہیں ہوتیں تو اسلام غرباء اور مساکین کی وکیلِ عام اسلامی ریاست کو حق دیتا ہے کہ وہ

(۱) یہ سب اسلامی ریاست کے محاصل ہیں اور ان سب کا بڑا حصہ وہ ہے کہ جو have-nots کی کفالت کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اسلامی ریاست میں taxes کی اجازت ہے۔

زکوۃ وغیرہ سے زائد جبراً بھی وصول کرے۔ یعنی یہ حق ملکیت اس طرح کی sanctity اور اس نوع کا تقدس نہیں رکھتا کہ جو ایک سرمایہ دارانہ نظام میں اس کو حاصل ہوتا ہے۔

(۲) قومیانا (Nationalisation): دوسری طرف اگر کسی ذریعہ پیداوار کو پبلک سیکٹر میں رکھتے ہوئے عدل کا تقاضا پورا نہ ہونے پائے تو اسلامی ریاست میں اس ذریعہ پیداوار کو قومیانے (nationalise) کی گنجائش بھی موجود ہے' کیونکہ اصل شے عدل ہے۔ اگر عدل کا تقاضا پورا نہیں ہوتا تو کسی بھی صنعت وغیرہ کو قومیانے میں کوئی قدغن اسلام کی رُو سے نہیں ہے۔

اس کی سب سے بڑی دلیل حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا اجتہاد ہے۔ جب عراق کی زمینیں فتح ہوئیں اور دجلہ وفرات کی سرزمین اور شام اور فلسطین کے انتہائی زرخیز علاقے اور سبزہ زار مسلمانوں نے فتح کیے تو مطالبہ کیا گیا کہ ان کو مجاہدین کے اندر تقسیم کر دیا جائے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس پر غور کیا اور یہ بڑا نزاعی مسئلہ بنا رہا۔ اس پر بڑی لے دے ہوئی' مجلس شوریٰ کے اجلاس منعقد ہوئے۔ دونوں طرف سے بھرپور دلائل دیے گئے' لیکن آخر کار حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہاد پر اجماع ہوا کہ ایسا کرنے سے عدل کے تقاضے پورے نہیں ہوں گے۔ لہٰذا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: سب زمینیں اسلامی ریاست کی ملکیت (سٹیٹ لینڈ) ہوں گی اور اس پر کام کرنے والے مزارعے (tenants) کی حیثیت سے برقرار رہیں گے۔ وہیں کے لوگوں کو حقوق دے دیے گئے۔ اگرچہ وہ ملکیت کے حقوق نہیں تھے لیکن ایک نوع کی موروثی مزارعت تھی کہ وہ ان میں زراعت کریں گے اور اسلامی ریاست ان سے لگان یا خراج وصول کرے گی۔ ذہن میں رکھیے کہ اگر خدانخواستہ اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ اجتہاد سامنے نہ آتا تو دُنیا میں بدترین جاگیرداری نظام اسلام کے ذریعے سے رائج ہو جاتا' کیونکہ عراق اور شام کے فاتحین کی تعداد محض چند ہزار تھی' اور اگر وہ تمام زمینیں ان میں تقسیم کر دی جاتیں تو وہ سب بڑے بڑے جاگیردار بن جاتے۔

آخری بات

میں نے یہ دو نظام آپ کے سامنے رکھے ہیں۔ اسلامی ریاست میں یہ نظام علیحدہ علیحدہ نہیں ہوتے' بیک وقت موجود ہوتے ہیں۔ اسلامی نظام کی برکات کا ظہور صرف اس قانونی نظام سے نہیں ہوگا۔ میں واضح کر دوں کہ جب تک معاشرے میں بالفعل ایسے لوگ موجود نہ ہوں جو ایمانی اور روحانی سطح پر زندگی بسر کر رہے ہوں' یہ مقصد حاصل نہ ہو سکے گا۔ ایک ہمارا معاشرہ ہے جس میں اصل قدر دولت کی ہے۔ جس کے پاس دولت و سرمایہ ہے وہ صاحب عزت ہے۔ اس سے بڑے سے بڑا نیک آدمی بھی جھک کر ملے گا۔ دوسری طرف ذرا چشم تصور میں لائیے شیخ احمد سرہندی یا سلطان الہند نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہما کو جو قرآن کی ایمانی تعلیمات کا مظہرِ اَتم ہیں' ان کو دنیا کی کسی شے سے کوئی رغبت نہیں ہے' وہ دنیا کی کسی شے کی ملکیت حاصل کر کے بھی فخر کرنے والے نہیں۔ دو وقت کی روٹی اور سر چھپانے کو چھت اگر ہے تو کافی ہے۔ اس پر مزید حصول کی ان کے سامنے کوئی اہمیت ہی نہیں۔ ان کی زندگی اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ دولت کے انبار اور شاہی سلطنت کا جاہ وجلال ان کو متاثر نہیں کرتا اور وہ عملی نمونہ ہیں ''قُلِ الْعَفْوَ'' کی قرآنی تعلیم کا۔ یہی وہ لوگ ہیں جو inspire کرتے ہیں اور ان سے معاشرے میں اَقدار کا تعین ہوتا ہے' جن کی موجودگی میں وہ ایمانی حقیقت سامنے رہتی ہے کہ اصل مسئلہ ''معاش'' کا نہیں' دنیا کی خاطر دوڑ دھوپ کا نہیں' بلکہ ''معاد'' کا ہے' آخرت کا ہے۔ اصل چیز دولت و ثروت نہیں' نیکی اور عمل صالح ہے۔ اللہ کی محبت' اس کی بندگی اور اس کے رسول ﷺ کی محبت اور ان کی سنت کا اتباع ہے۔ اور اگر روشنی کے یہ مینار بالفعل موجود نہ ہوں تو میں یہ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ صرف قانونی نظام سے اسلام کی برکات کا ظہور کبھی نہیں ہوگا۔

اس بات کو ناگزیر ضرورت کی حیثیت سے اپنے سامنے رکھیے کہ معاشرے میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی مثال کو زندہ رہنا چاہیے۔ ہمیں اصحابِ صُفّہ کا فقر سامنے رکھنا چاہیے کہ ان کے پاس لنگوٹیاں تھیں تو اتنی کہ سجدے میں جاتے ہوئے ان کو اندیشہ ہوتا

کہ کہیں ان کا ستر نہ کھل جائے' پیچھے والے ان کا ننگ نہ دیکھیں۔ منتظر رہتے کہ جب سب لوگ سجدے میں چلے جائیں تو وہ سجدے میں جائیں۔ یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے سب کچھ تج دیا تھا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے واسطے۔ انہی میں سے ہیں حضرت ابوالدرداء' حضرت انس بن مالک' حضرت مقداد' حضرت ابو ہریرہ اور انہی میں ہیں حضرت ابوذر غفاری بھی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔ اگر معاشرے میں بالفعل وہ لوگ موجود نہ ہوں جن کے بارے میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ وہ لوگ بھی ہیں کہ کہیں رشتہ کرنا چاہیں تو کوئی انہیں رشتہ نہ دے' کسی کی سفارش کرنا چاہیں تو کوئی ان کی بات ہی نہ سنے۔ لیکن اللہ کے ہاں ان کا مقام یہ ہے کہ کسی بات پر اگر وہ اللہ کی قسم کھا بیٹھیں تو اللہ ان کی قسم کی لاج رکھے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ''پیکر محسوس'' کے خوگر انسان اپنی آنکھوں سے ایسے لوگوں کو دیکھیں اور پھر ان میں جذبہ بیدار ہو قربانی کا' خدا پرستی کا' سادگی کا۔

آخر میں یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ دین کل کی حیثیت سے ایک وحدت (organic whole) ہے۔ ہم نے اپنی سہولت کے لیے اس کے حصے بخرے کر لیے ہیں۔ جو چیزیں طبیعت پر گراں گزریں ان میں حیلوں کی چابی لگا کر حلت و جواز کے لیے کہیں نہ کہیں سے کوئی راستے نکال لیے۔ اور اب جو نتیجہ اس سے نکلا ہے آپ اس کے اوپر صرف لیبل بدل کر عوام کو یہ باور کرانا چاہیں کہ اسلام آ گیا ہے تو یہ اسلام کے ساتھ سب سے بڑی دشمنی ہوگی۔

ہر دور کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں' آج وہ تقاضے یکسر بدل چکے ہیں (کسی دَور میں استحسان اور مصالحِ مُرسلہ کا کسی ایک طرف رُخ تھا تو آج دوسری طرف رُخ ہے) آج ضرورت ہے کہ اجتہاد کر کے اسلام کا پورا نظام جدید دَور کے تقاضوں کے مطابق اپنی کلیت (totality) کے ساتھ لوگوں کے سامنے لایا جائے کہ یہ ہے اسلامی نظام۔ اگر نافذ کرنا ہے تو اس کو پورے کا پورا نافذ کرنا ہوگا اور اسی کی ایک حقیر سی کوشش میں نے اس وقت کی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

سرمایہ اور محنت

محترم صدرِ مجلس اور معزز خواتین وحضرات! آج میں اس مجلس میں خطاب کرتے ہوئے کچھ دقت سی محسوس کر رہا ہوں۔ اس لیے کہ اگرچہ میں قرآن مجید کا ایک ادنیٰ طالب علم اور اسلام کا ایک ادنیٰ خادم ہوں اور اس اعتبار سے مجھے زندگی کے تمام مسائل کے بارے میں قرآن مجید کی راہنمائی پیش کرنے کا اہل ہونا چاہیے' تاہم یہ ٹیکنیکل مسئلہ کہ سرمایہ اور محنت کے درمیان توازن کیسے پیدا کیا جائے' واقعتاً دورِ جدید کے مشکل اور پیچیدہ ترین مسائل میں سے ہے' بلکہ اس کو اگر تقریباً لاینحل کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے اس امر سے کہ مجھے اس میدان میں کبھی کوئی عملی تجربہ نہیں ہوا۔ چنانچہ ایک طرف میں معروف معنی میں محنت کش بھی نہیں اور دوسری جانب سرمایہ دار تو کیا' سرمایہ کار' بھی نہیں ہوں' لہٰذا اس کوچے میں میری حیثیت عملی اعتبار سے بالکل نووارد کی سی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ محترم بہن صبیحہ شکیل صاحبہ اور محترم سردار صاحب نے میرے لیے مزید دِقت پیدا کر دی یہ فرما کر کہ وہ تو اس اجلاس میں اصلاً میری تقریر سننے کے لیے آئے ہیں۔ بعض دوسرے اصحاب نے بھی اصل راہنمائی کا بوجھ میرے کاندھوں پر ڈال کر میری ذمہ داری میں اضافہ کر دیا ہے۔ لہٰذا میں پوری کوشش کروں گا کہ اس موضوع پر دین کا جو بھی تھوڑا بہت فہم مجھے حاصل ہے اس کی روشنی میں ان مسائل کا ممکنہ حل آپ کے سامنے رکھوں۔ بیدہ التوفیق و علیہ التکلان!

(یہ مقالہ محکمہ محنت پنجاب کے مضامین سے انتخاب کیا گیا۔)

آجر اور اجیر نہیں، آجر اور مستاجر

ہمارے ہاں بعض اصطلاحات بہت غلط استعمال ہوتی ہیں۔ آجر اور اجیر میں کوئی فرق نہیں بلکہ دونوں کے معنی ایک ہی ہیں، یعنی اُجرت پر کام کرنے والا۔ اُجرت پر کام کرانے والے کے لیے اصل اصطلاح ''مستاجر'' ہے۔ اسی قبیل کا ایک لفظ ''متوفی'' ہے جس کے اصل معنی ہیں وفات دینے والا، یعنی اللہ، نہ کہ جو فوت ہو رہا ہے، جس کے لیے اصل لفظ ''متوفیٰ'' ہے۔ ایسا ہی ایک لفظ ''مغویہ'' ہے جس کے معنی ہیں ''اغوا کرنے والی'' جبکہ اغوا کی جانے والی ''مغواۃ'' ہے۔ تو مستاجر وہ شخص ہے جو کسی سے اُجرت پر کام لے رہا ہو اور آجر (یا اجیر) وہ شخص ہے جو اُجرت پر کسی کے ہاں کام کر رہا ہو۔

محنت یا عمل

چونکہ مقالے کا اصل موضوع ہے ''اسلام میں محنت کا تصور'' اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لفظ محنت پر بھی کچھ عرض کر دیا جائے۔ یہ لفظ اگرچہ عربی زبان ہی کا ہے مگر نہ قرآن مجید میں اس معنی میں استعمال ہوا ہے، نہ حدیث نبویؐ میں، نہ ہی موجودہ فصیح عربی میں یہ اس معنی میں مستعمل ہے۔ قرآن و حدیث کی اصل اصطلاح ''عَامِل'' ہے۔ یعنی عمل کرنے والا یا محنت کرنے والا۔ پھر دوسرا لفظ وہی آجر یا اجیر استعمال ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں کمائی کا اصل تصور

اس موقع پر یہ وضاحت مناسب ہوگی کہ اس مسئلے پر ہمارے لیے قرآن مجید و حدیث میں بہت کم راہنمائی موجود ہے۔ اس لیے کہ قرآن مجید کی رُو سے انسان کی اصل ''کمائی'' نیکی یا بدی کی ہے، چنانچہ اس میں اصل زور ''کسبِ خیر'' کی ترغیب اور ''کسبِ شر'' سے اجتناب پر ہے، یعنی قرآن کا اصل زور (emphasis) معاش پر نہیں بلکہ ''معاد'' پر ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ سوائے ایک آدھ استثنائی مثال کے ''کسب'' کا لفظ قرآن مجید میں رزق کے لیے استعمال ہی نہیں ہوا۔ الغرض از رُوئے قرآن انسان کی اصل کمائی وہ خیر و شر یا بھلائی یا برائی ہے جو وہ آخرت کے لیے کما رہا ہے، یہ اصل کسب ہے۔ اس کے برعکس رزق کے لیے قرآن مجید کی اصل اصطلاح ''فضل'' ہے، یعنی

قرآن جو تصور دیتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کو جو کچھ ملتا ہے وہ اس کی محنت کا حاصل یا صلہ نہیں بلکہ فضلِ خداوندی ہے۔ قرآن کے نزدیک یہ قارونیت ہے کہ انسان اس مغالطے یا زعم میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ جو دنیوی ساز وسامان یا مال ومتاع اسے حاصل ہے وہ اس کا اپنا پیدا کردہ ہے‘ جیسے کہ قارون نے کہا تھا: ﴿اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ﴾ (القصص:۷۸) یعنی یہ سب کچھ تو مجھے اپنے علم کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔ گویا یہ میرے علم وفہم‘ میری ذہانت وفطانت‘ میری پیش بینی وپیش بندی‘ میری پلاننگ اور دوراندیشی (foresight) کا نتیجہ ہے۔ قرآن مجید اس کی نفی کرتا ہے۔ اس کی تعلیمات کی رُو سے محنت انسان ضرور کرتا ہے‘ مگر جو کچھ اس کو ملتا ہے وہ سراسر اللہ کا فضل ہے نہ کہ اس کی محنت کا حاصل یا صلہ۔ اسلام کے اخلاقی نظام کے لیے اصل بنیاد یہی تصور فراہم کرتا ہے‘ جبکہ سرمایہ دارانہ ذہنیت کی اصل بنیاد ہے ”قارونیت“۔

محنت کا ذکر حدیث نبوی ﷺ میں

احادیث مبارکہ میں محنت یعنی مزدوری اور عملِ ید یعنی انسان کے خود اپنے ہاتھ سے کام کرنے کی بڑی عظمت وفضیلت وارد ہوئی ہے۔ مثلاً صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں:

((مَا بَعَثَ اللّٰهُ نَبِيًّا اِلَّا رَعَى الْغَنَمَ)) فَقَالَ اَصْحَابُهٗ وَاَنْتَ؟ قَالَ: ((نَعَمْ، كُنْتُ اَرْعَاهَا عَلٰى قَرَارِيْطَ لِاَهْلِ مَكَّةَ))

یعنی اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی مبعوث نہیں فرمایا جس نے اُجرت پر بھیڑیں نہ چرائی ہوں۔ صحابہؓ نے (متحیر ہو کر) سوال کیا: اللہ کے رسول ﷺ کیا آپ نے بھی یہ کام کیا ہے؟ اس کا جو جواب نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا وہ ہم سب کے لیے بہت اہم ہے‘ اس لیے کہ اس میں آنحضور ﷺ کا تواضع وانکسار بھی نمایاں طور پر جھلک رہا ہے:

”میں تو چند قراریط کے عوض (چند ٹکوں کے عوض) مکہ کے لوگوں کے جانور چرایا کرتا تھا۔“

معلوم ہوا کہ اجرت یا مزدوری پر دوسروں کے لیے کام کرنا ہرگز باعث ندامت یا

موجب شرم نہیں ہے۔ اس لیے کہ اگرچہ یہ تو مسلّمات میں سے ہے کہ جو شخص خود اپنے سرمائے سے کام کر رہا ہو' خواہ وہ چھابڑی ہی لگاتا ہو' اس کے لیے کسی احساسِ کمتری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جبکہ انسان کسی اور کے لیے اُجرت پر کام کرنے میں یقیناً عار محسوس کرتا ہے۔ لیکن نبی اکرم ﷺ نے اس کے لیے فرمایا کہ میں خود اجرت پر دُوسروں کے لیے کام کرتا رہا ہوں۔ لہٰذا یہ قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ یہ ہرگز ایسی بات نہیں ہے جس پر انسان کسی بھی درجے میں ندامت یا شرم محسوس کرے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام بحیثیت اجیر

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اُجرت پر کام کرنے کا ثبوت قرآن مجید سے ملتا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام پورا صحرائے سینا پیدل عبور کر کے ''ماءِ مدین'' یعنی مدین کی بستی کے باہر کنویں پر پہنچے تو قرآن مجید نے ان کی اُس وقت کی بے چارگی اور دنیوی اعتبار سے بے وسیلہ ہونے کی کیفیت کا نقشہ کھینچنے کے لیے ان کی دعا کے یہ الفاظ نقل فرمائے ہیں: ﴿رَبِّ اِنِّیۡ لِمَاۤ اَنۡزَلۡتَ اِلَیَّ مِنۡ خَیۡرٍ فَقِیۡرٌ ﴿۲۴﴾﴾ (القصص) ''پروردگار! جو خیر بھی تو میری جھولی میں ڈال دے میں اس کا محتاج ہوں''۔ یعنی میری حالت اُس فقیر و مسکین کی ہے جسے ایک پیسہ بھی دیا جائے تو وہ اسے نہیں ٹھکراتا' بلکہ شکریے کے ساتھ قبول کرتا ہے۔ تو یہ ہیں وہ الفاظ جو اللہ کے ایک جلیل القدر رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے نکلے۔ وہاں جب اللہ تعالیٰ نے یہ صورت پیدا فرما دی کہ شیخِ مدین کی صاحبزادیوں نے ان کی جس جسمانی قوت اور اخلاقی عصمت وعفت کا بچشمِ سر مشاہدہ کیا تھا اس کی بنا پر انہوں نے اپنے والد سے سفارش کی: ﴿یٰۤاَبَتِ اسۡتَاۡجِرۡہُ ۫ اِنَّ خَیۡرَ مَنِ اسۡتَاۡجَرۡتَ الۡقَوِیُّ الۡاَمِیۡنُ ﴿۲۶﴾﴾ (القصص) یعنی ابا جان! اس شخص کو ملازم رکھ لیجیے' بہترین شخص جسے آپ اُجرت پر کام کرنے کے لیے رکھیں قوی بھی ہونا چاہیے اور امین بھی' اور یہ دونوں صفات اس میں موجود ہیں۔ اور شیخ مدین نے آگے بڑھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی ان دونوں بیٹیوں میں سے ایک کے نکاح کی پیشکش کر دی تو آٹھ یا دس برس کی مزدوری ان کا مہر قرار پایا۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی عصمت وعفت

کی حفاظت اور اپنا پیٹ بھرنے کے لیے آٹھ یا دس سال مسلسل مزدوری کی۔

((إنَّ مُوسٰی عَلَیْہِ السَّلَامَ آجَرَ نَفْسَہٗ ثَمَانِیَ سِنِیْنَ اَوْ عَشْرًا عَلٰی عِفَّۃِ فَرْجِہٖ وَطَعَامِ بَطْنِہٖ)) (رواہ ابن ماجہ)

حضرت داؤد علیہ السلام اور عملِ ید

اسی طرح صحیح بخاری ہی کی ایک اور حدیث کا حوالہ بھی یہاں بے محل نہ ہوگا۔

حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَا اَکَلَ اَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَیْرًا مِّنْ اَنْ یَّاْکُلَ مِنْ عَمَلِ یَدِہٖ، وَکَانَ نَبِیُّ اللّٰہِ دَاوٗدَ عَلَیْہِ السَّلَامَ یَاْکُلُ مِنْ عَمَلِ یَدِہٖ))

"کسی شخص نے اس سے بہتر روزی نہیں کھائی جس نے اپنے ہاتھ سے کام کر کے روزی کمائی اور اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ سے کام کر کے روزی کماتے تھے۔"

ناصر الدین محمودؒ اور اورنگزیب عالمگیرؒ

یہی بات ہمیں اپنے ماضی قریب کی روایات میں بھی نظر آجاتی ہے۔ ناصر الدین محمودؒ اور اورنگ زیب عالمگیرؒ جیسے بادشاہ اسی برعظیم میں گزرے ہیں جنہوں نے شاہی خزانے سے کوئی استفادہ کرنے کی بجائے خود محنت کر کے اپنی گزرِ اوقات کا سامان مہیا کیا۔ یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ یہ باتیں سطحی نہیں ہیں بلکہ اپنے اندر گہرائی لیے ہوئے ہیں۔ اگر یہ باتیں ہماری فکر و سوچ میں سرایت کر جائیں تو ایک عظیم انقلاب واقع ہو جائے۔

اُجرت کی ادائیگی میں عجلت

اب آیئے اس موضوع پر دینی تعلیمات کے دوسرے جزو کی طرف، یعنی ان روایات کی جانب جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے محنت کشوں کے حقوق کے سلسلے میں دی ہیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے تو سنن ابن ماجہ کی وہ مشہور حدیث آتی ہے جس کے راوی حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما ہیں۔ یعنی:

((اُعْطُوا الْاَجِیْرَ اَجْرَہٗ قَبْلَ اَنْ یَّجِفَّ عَرَقُہٗ))

''مزدور کو اس کی اجرت ادا کر دو اس سے پہلے کہ اس کا پسینہ خشک ہو۔''

ماتحتوں کے ساتھ حسنِ سلوک

اور دوسری حد درجہ جامع حدیث وہ ہے جو ماتحتوں کے ساتھ حسن سلوک کے سلسلہ میں امام بخاری اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے حضرت معمور بن سوید رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی ہے' جس میں اصل واقعہ تو حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا بیان ہوا ہے' لیکن ضمناً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مستقل اور دائمی ہدایات بھی نقل ہوگئی ہیں۔

حضرت معمور بن سوید بیان فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو ان کے غلام کے ساتھ دیکھا کہ دونوں نے بالکل ایک ہی طرح کا حُلّہ پہن رکھا تھا۔ اس پر میں نے ان سے اس کے بارے میں پوچھا تو حضرت ابوذرؓ نے فرمایا کہ میں نے ایک مرتبہ اپنے غلام کو گالی دی تو اُس کی ماں کو برا بھلا کہا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت سرزنش کی اور ارشاد فرمایا: ''اے ابوذر! تم ایک ایسے شخص ہو جس میں ابھی جاہلیت کے آثار باقی ہیں''۔ پھر فرمایا: ((اِخْوَانُكُمْ خَوَلُكُمْ جَعَلَهُمُ اللّٰهُ تَحْتَ اَيْدِيكُمْ)) ''یہ تمہارے ہی بھائی ہیں (انسان ہیں' آدم اور حوا کی نسل سے ہیں)' تمہارے خدمت گار ہیں' اللہ نے انہیں تمہارے ماتحت کر دیا ہے''۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم حکم دیتے ہیں:

((فَمَنْ كَانَ اَخُوْهُ تَحْتَ يَدِهٖ فَلْيُطْعِمْهُ مِمَّا يَاْكُلُ وَلْيُلْبِسْهُ مِمَّا يَلْبَسُ، وَلَا تُكَلِّفُوْهُمْ مَا يَغْلِبُهُمْ، فَاِنْ كَلَّفْتُمُوْهُمْ فَاَعِيْنُوْهُمْ))

''تو جس شخص کے ماتحت اللہ نے اُس کے کسی بھائی کو کر دیا ہو تو اسے چاہیے کہ جو کھانا وہ خود کھاتا ہے اسے بھی کھلائے اور جو لباس خود پہنتا ہے اسے بھی پہنائے۔ اور ان پر اتنا بار نہ ڈالو جس سے وہ دب کر رہ جائیں' اور اگر ایسی مشقت ڈالنی لازم ہی ہو جائے تو اس کام میں (خود بھی شریک ہو جاؤ اور) ان کی مدد کرو۔'' جے

سوال کی مذمت اور محنت مزدوری کی ترغیب دونوں

یہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح سوال کرنے کی بجائے محنت مزدوری کر کے اپنی ان مزدوری لیٹ پالنے کی ترغیب دلائی ہے وہ بھی پیش نظر رہے۔ حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ سے

مروی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَأَنْ يَأْخُذَ أَحَدُكُمْ أَحْبُلَهُ [فَيَأْتِيَ الْجَبَلَ] فَيَأْتِيَ بِحُزْمَةِ الْحَطَبِ عَلَى ظَهْرِهِ فَيَبِيعَهَا فَيَكُفَّ اللّٰهُ بِهَا وَجْهَهُ خَيْرٌ لَّهُ مِنْ أَنْ يَسْأَلَ النَّاسَ أَعْطَوْهُ أَوْ مَنَعُوهُ)) (رواہ البخاری واحمد وابن ماجہ)

''تم میں سے کسی شخص کا اپنی رسی لے کر پہاڑ پر چلے جانا اور پھر لکڑیوں کا گٹھا پیٹھ پر لاد کر لانا اور اُسے بیچنا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کا اس کے چہرے (یعنی عزتِ نفس) کو بچانا اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ لوگوں سے سوال کرے' وہ چاہیں تو اس کو کچھ دے دیں اور چاہیں تو خالی ہاتھ لوٹا دیں۔''

تو یہ ہیں وہ اصول جو نبی اکرم ﷺ نے ماتحتوں کے بارے میں وضع فرمائے ہیں اور یہی ہیں وہ اخلاقی تعلیمات کہ جب تک وہ کسی معاشرے میں بالفعل موجود نہ ہوں تو محض کوئی خشک قانونی ڈھانچہ' خواہ اس کی کتنی ہی پیروی کیوں نہ کر لی جائے' معاشرے میں وہ برکات پیدا نہیں کر سکتا جو اسلام کی منشا ہیں اور جن کی ہم توقع رکھتے ہیں۔

اب میں اصل مسئلے کی طرف آتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ مسئلہ بہت پیچیدہ ہے' کیونکہ ایک تو اس کا تعلق نظامِ اقتصادی کے ساتھ ہے اور دوسرے یہ کہ یہ کوئی الگ تھلگ مسئلہ نہیں ہے' بلکہ انسانی اجتماعیات کے تمام پہلو یعنی سماجی' سیاسی اور معاشی مل کر ایک ناقابلِ تقسیم وحدت بنتے ہیں' ان میں سے کسی ایک کو علیحدہ کر کے اس پر غور نہیں کیا جا سکتا۔ ایک فلسفۂ زندگی اور نظریۂ حیات کی بنیاد پر جو نظامِ حیات وجود میں آئے گا اس کا اپنا ایک سماجی نظریہ ہوگا' اور اسی کے ساتھ مناسبت رکھنے والا ایک معاشی نظام وجود میں آئے گا' اور اسی نوعیت کا سیاسی ڈھانچہ بھی ترتیب پائے گا' اور سب مل کر ایک حیاتیاتی وحدت (organic whole) بن جائیں گے' لہٰذا ان میں سے کسی ایک جزو کو نکال کر اس کی کسی اور نظام کے ساتھ پیوند کاری ناممکن العمل فعل ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں جو اصطلاحات مستعمل ہیں' مثلاً اسلامی جمہوریت اور اسلامی سوشلزم' ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاید اسلام کے ایمانیات' عبادات اور اخلاقیات لے کر دوسرے نظام ہائے زندگی

کی عملی تشکیل کے مابین پیوند کاری کر سکتے ہیں۔ میرے نزدیک یہی اصل مغالطہ ہے۔ اسلام کی بنیاد اپنے ایک نظریے پر ہے جسے ہم ایمان کہتے ہیں۔ اس جڑ پر اگر تنا کھڑا ہوگا تو اس سے نکلنے والی تمام شاخیں باہم مربوط ہوں گی۔ لیکن اگر وہ جڑ کمزور ہو یا اس جڑ کا بحیثیت جڑ سرے سے وجود ہی نہ ہو تو کسی بھی مصنوعی طریقے سے پیوند کاری کر کے اسلام کی برکات حاصل نہیں کی جا سکتیں۔

ایمان کیا ہے؟

اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر اس یقین کے ساتھ ایمان کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور جو راہ اُس کے پیارے رسول ﷺ نے دکھائی اس پر چلے بغیر اس زندگی اور آخرت کی زندگی میں کامیابی نہیں' اور اس بات کا یقین کہ آخرت میں ہمارے عمل کا نیکی اور برائی کی صورت میں بدلہ ملے گا' یہ یقین ہی ایمان کی وہ بنیاد فراہم کرتا ہے کہ ہماری یہ دنیوی زندگی ہی حرفِ آخر نہیں بلکہ اصل زندگی تو موت کے بعد کی ہے اور انسان کا اصل مسئلہ بعد الموت زندگی سے متعلق ہے۔ رہی اس دنیا کی ناپائیدار زندگی تو یہ فانی ہے' عارضی ہے' اس کی کوئی حیثیت نہیں' اور اگر کچھ ہے بھی تو نہ ہونے کے برابر۔ ایمان کی یہ دو بنیادیں قرآن مجید کی اس ایک آیت میں سموئی ہوئی ہیں: ﴿إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّآ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ یعنی اللہ ہی ہمارا مبدأ و معاد ہے' ہم اُس کی طرف سے آئے ہیں اور اُسی کی طرف جانے والے ہیں۔ گویا یہ ایک سفر ہے۔ جب فی الواقع ایمان کی یہ دو بنیادیں قائم ہو جائیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ: ((كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ)) (رواہ البخاری والترمذی) کے مصداق ایک ''اجنبی'' یا راہ چلتے مسافر کی طرح زندگی بسر کرنے کا سلیقہ آ جاتا ہے۔ راہ چلتے مسافر کو اس راہ گزر سے جس قدر دلچسپی ہوتی ہے مؤمن کو بھی اس دُنیا سے اتنی ہی دلچسپی ہوتی ہے۔

اسلامی نظام کا وجود

اس وقت دنیا میں بالفعل تو دو ہی نظام ہائے معیشت موجود ہیں' یعنی سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت۔ رہا اسلام کا نظامِ معیشت تو وہ دنیا کی ایک اِنچ زمین پر بھی بالفعل

قائم نہیں ہے' اس کا وجود تو صرف ہمارے ذہنوں میں ہے یا ہماری زبانوں کی نوک پر یا اسی قبیل کی چیز ہے قلم جس تک یہ تصور محدود ہے۔

اسلام بمقابلہ اشتراکیت و سرمایہ داریت

یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ اگرچہ اشتراکیت (Communism) اور سرمایہ داریت (Capitalism) دونوں بظاہر ایک دوسرے کی ضد ہیں' ایک مشرق ہے تو دوسرا مغرب' لیکن اسلام کے مقابلے میں ان دونوں میں ایک قدر مشترک ہے۔ یہ آپس میں تو متضاد اور متقابل ہیں لیکن اسلام کے مقابلے میں اپنے فکری پس منظر کے ساتھ ایک ہی تنے کی دو شاخیں ہیں۔ اسلام جہاں مادّیت کے مقابلے میں رُوحانیت اور اس دنیوی زندگی کے مقابلے میں آخرت کی دعوت دیتا ہے یہ دونوں نظام صرف اور صرف مادہ پرستی کی بنیاد پر قائم ہیں۔ یہ فلسفۂ مادّیت ہی تھا جس نے ایک قدم آگے بڑھا کر جدلی مادّیت (Dialectical Materialism) کی شکل اختیار کر لی اور کمیونزم وجود میں آیا۔

اسلام کا معاملہ ان دونوں سے مختلف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام اپنی ہی قائم کردہ بنیادوں پر اپنے مکمل ڈھانچے میں قائم ہو سکتا ہے اور کسی قسم کی پیوند کاری قبول نہیں کرتا۔ لہٰذا جب تک وہ نظریاتی بنیاد استوار نہ ہو اسلامی نظام کے ڈھانچے کا خیال گھوڑے کے آگے گاڑی باندھنے کے مترادف ہوگا۔ پہلے نظریاتی بنیاد کا استحکام ضروری ہے' اس لیے کہ اسلام تو ''ایمان'' ہی کی بنیاد پر قائم ہوگا۔ اس کے علاوہ کسی اور جڑ یا بنیاد پر اس کے قیام کا تصور ہی بے کار ہے۔

اسلام میں عدل و قسط کی اہمیت

اسلام کی متذکرہ بالا اساس یعنی ایمان کو استوار کرنے کے ساتھ ساتھ اِس بات سے انکار بھی ممکن نہیں ہے کہ اسلام نے عدل و قسط کے قیام کو بھی بنیادی اہمیت دی ہے۔ شریعت' انزالِ کتب اور بعثتِ رُسل کا مقصد' نیز دین کا پورا ڈھانچہ' ان سب کا مرکزی خیال قیامِ عدل و قسط ہے' یعنی عدل و انصاف پر مبنی ایک نظامِ حیات کا قیام گویا اسلام و ایمان کا بنیادی تقاضا ہے۔

چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ''قَآئِمًا بِالْقِسْطِ'' (انصاف کا قائم کرنے والا) بھی آئی ہے۔ اس کے علاوہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ﴾ (النساء: ۱۳۵)

''اے ایمان والو! عدل اور قسط کے قائم کرنے والے اور اللہ کے گواہ بنو۔''

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ﴾ (المائدۃ: ۸)

''اے اہلِ ایمان! اللہ کی خاطر راستی پر قائم ہونے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔''

یہ ایک ہی بات کو دو پیرایوں میں بیان کیا گیا ہے' لیکن اس خوب صورت انداز میں کہ رُوح وجد کرنے لگتی ہے۔ اس کے علاوہ فرمایا:

﴿ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ (الحدید: ۲۵)

''ہم نے بھیجے اپنے رسول بیّنات دے کر اور ہم نے اتاری ان کے ساتھ کتاب اور میزان تاکہ لوگ عدل وانصاف پر قائم رہیں۔''

﴿وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنْ کِتٰبٍ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ﴾ (الشوریٰ: ۱۵)

''اور کہو: میں ایمان رکھتا ہوں اس پر جو اللہ نے مجھ پر اُتارا' اور مجھے حکم ہوا ہے کہ میں تمہارے مابین عدل کروں۔''

چنانچہ فاتح ایران حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے جب ایرانیوں نے پوچھا کہ آپ ہم پر کیوں حملہ آور ہوئے تو آپؓ نے جواباً فرمایا:

اِنَّا قد اُرسلنا لنخرج الناس من ظلمات الجھالۃ الی نُورِ الایمان ومن جور الملوك الی عدل الاسلام

''ہمیں بھیجا گیا ہے کہ ہم لوگوں کو جہالت کے اندھیروں سے نورِ ایمان کی طرف نکالیں اور شہنشاہی استبداد سے نجات دلا کر عدلِ اسلام سے روشناس کرائیں۔''

اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بیعتِ خلافت کے بعد جو خطبہ ارشاد فرمایا وہ اسلامی مملکت کے اصول متعین کرتا ہے۔ آپؓ نے فرمایا: ''تم میں سے ہر قوی میرے

نزدیک ضعیف ہے جب تک اس سے حق وصول نہ کرلوں اور تم میں سے ہر ضعیف میرے نزدیک قوی ہے جب تک اس کا حق نہ دِلوا دوں"۔ گویا نظامِ عدل وقسط کا قیام' اسلامی ریاست کا بنیادی مقصد ہے۔

امتیازی سلوگن

ہر نظام میں کچھ الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے مفہوم کے اعتبار سے اس نظام کا امتیازی سلوگن (slogan) بن جاتے ہیں۔ Capitalism میں آزادی (freedom) کی تکرار ملے گی۔ یہ گویا ان کے فکر کی بنیاد اور مرکز ومحور ہے۔ اسی طرح اشتراکیت (Socialism) میں مساوات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اس میں نوعِ انسانی کے لیے کشش ہے۔ اس مرحلے پر یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ دونوں اعلیٰ قدریں ہیں۔ آزادی بھی ایک اعلیٰ قدر ہے اور مساوات بھی۔ ان کے مقابلے میں اسلام نے' جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے' عدل کا تصور دیا ہے' وہ آزادی اور مساوات کے درمیان بھی عدل کا راستہ تجویز کرتا ہے۔ نہ تو آزادی اس قدر بڑھ جائے کہ مساوات کو ہڑپ کر جائے اور نہ مساوات کا ہوّا کھڑا ہو کر آزادی جیسی اعلیٰ اقدار سے انسانی معاشرہ کو محروم کر دے۔ "آزادی کی قیمت پر مساوات اور مساوات کی قیمت پر آزادی" اسلام ان دونوں کے حق میں نہیں ہے۔ اسلام عدل چاہتا ہے اور یہی وہ لفظ ہے جس کو اسلام کا امتیازی slogan قرار دیا گیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ دُنیا میں نظامِ عدل کے قیام کی غرض آخر کیا ہے؟ اس طرف انسانی اجتماعیات کے بہت بڑے عالم حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نے توجہ دلائی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"قرآن حکیم کی واضح تعلیمات کے مطابق مسلم معاشرے کو حکم دیا گیا ہے کہ نہ اسراف کیا جائے نہ تبذیر' بلکہ راہِ اعتدال اختیار کی جائے۔ اسراف کا مطلب ہے حد سے زیادہ خرچ کرنا اور تبذیر سے مراد ہے بے جا اور فضول خرچ کرنا۔

(۱) ﴿وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴾ (الاعراف)

"اور کھاؤ پیو لیکن اسراف نہ کرو' بے شک وہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔"

(۲) ﴿ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا ﴿٢٦﴾ إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوٓا إِخْوَانَ الشَّيٰطِينِ ﴾ (بنی اسراء یل)

''اور بے جا خرچ نہ کرو' بیشک بے جا خرچ کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں۔''

(۳) ﴿ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا ﴿٢٩﴾ ﴾ (بنی اسراء یل)

''اور اپنے ہاتھ کو اپنی گردن کے ساتھ باندھ کر نہ رکھ اور نہ اسے بالکل ہی کھول دے ورنہ تو بیٹھ رہے گا الزام کھایا ہارا ہوا۔''

(۴) ﴿ وَالَّذِينَ إِذَآ أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا ﴿٦٧﴾ ﴾ (الفرقان)

''اور (رحمٰن کے بندے) وہ لوگ ہیں جو خرچ کرتے ہیں تو فضول خرچی نہیں کرتے اور نہ تنگی کرتے ہیں' بلکہ (ان کا خرچ) ان دونوں کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے۔''

معاشرے کے تین معروف معیارات

عموماً معاشرے میں تین قسم کے معیارِ زندگی پائے جاتے ہیں:

ا: رفاہیتِ بالغہ' یعنی عیاشانہ معیارِ زندگی' جس میں اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کی چیز پسند کی جاتی ہے۔ اس طرح حد سے زیادہ بلکہ بے جا خرچ کیا جاتا ہے اور دولت کو ضائع کیا جاتا ہے۔

ب: رفاہیتِ ناقصہ' یعنی پست معیارِ زندگی' جس میں زندگی کی ضروریات بھی پوری طرح حاصل نہیں ہوتیں اور جانوروں کی سی زندگی بسر کی جاتی ہے۔

ج: رفاہیتِ متوسط' یعنی درمیانہ معیارِ زندگی' جس میں زندگی کی ضروریات متوسط درجے میں حاصل ہوتی ہیں اور انسان اتنی فراغت پاتا ہے کہ وہ اپنی اور دوسروں کی بھلائی کے لیے بھی کوئی کام کر سکے اور خدا کو بھی یاد کر سکے۔

اللہ تعالیٰ نے رفاہیتِ بالغہ یعنی عیاشی کو ناپسند فرمایا ہے اور ایسی معاشرت اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے جس سے انسان دنیا کی طلب کے اندر ہی الجھ کر رہ جائے اور معیشت کی باریکیوں میں اُتر جائے اور اس کے اندر انتہائی تعمق اور غلو کرنے لگے۔ چنانچہ ریشم' سونے چاندی کے برتن اور بھاری زیورات مثلاً کنگن' گلوبند' ہار' طوق'

بازیب وغیرہ کا استعمال اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہیں' کیونکہ یہ چیزیں انسان کو "اسفل سافلین" میں پہنچا دیتی ہیں اور انسانی افکار کو مختلف قسم کی باریکیوں میں الجھا دیتی ہیں۔ رفاہیت کی اصل حقیقت یہ ہے کہ معاشرتی زندگی میں اچھی چیزیں طلب کی جائیں اور ادنیٰ سے اعراض کیا جائے۔ لیکن رفاہیتِ بالغہ یہ ہے کہ ایک ہی چیز میں سے سب سے اعلیٰ کا انتخاب کیا جائے۔

رفاہیتِ ناقصہ عموماً ان لوگوں کا معیارِ زندگی ہوتا ہے جو آبادیوں سے دُور پہاڑی علاقوں میں رہتے ہیں اور ان کا حال وحشی جانوروں کا سا ہوتا ہے۔ شہروں کے وہ لوگ بھی اس ذیل میں آتے ہیں جو دوسروں کی خاطر محنت کرتے ہیں مگر انہیں پورا معاوضہ نہیں ملتا۔ پھر ان پر طرح طرح کے ٹیکس لگا دیے جاتے ہیں جن سے ان کی حالت گدھوں اور بیلوں کی ہو جاتی ہے جن سے سخت کام لیا جاتا ہے اور محض زندہ رہنے کے لیے کچھ کھانے کو دے دیا جاتا ہے۔ پھر ان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ محنت و مشقت سے فرصت ہی نہیں پاتے اور نہ وہ سعادتِ اُخرویہ کی طرف متوجہ ہو پاتے ہیں' بلکہ ان میں سعادت اُخرویہ کا احساس ہی فنا ہو جاتا ہے' اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ ملک بھر میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں رہتا جو دین کے مطابق کوئی حرکت کر سکے۔" (حجۃ اللہ البالغہ)

اگر اس طریقے سے انسان جکڑے ہوئے ہوں جس طرح بنی اسرائیل کو فرعونیوں نے جکڑا ہوا تھا کہ صبح سے لے کر شام تک ان سے بیگار لی جا رہی ہے' کسی اور بات یا اعلیٰ قدر کی طرف متوجہ ہونے کی انہیں فرصت ہی نہیں ہے۔ اس طرح اگر کسی انسانی معاشرے میں معاشی ناہمواری کی یہ کیفیت ہو جائے کہ لوگوں کی اکثریت صرف دال روٹی کے حصول میں سرگرداں ہو۔ معاملہ جب یہ ہو جائے کہ انسان بنیادی ضروریات کی فراہمی کے لیے کمر توڑ دینے والی محنت کرے اور پھر بھی اس کی ضروریات پوری نہ ہوں تو انسان کا حیوانی سطح پر آ جانا کوئی بعید از قیاس بات نہیں۔ اس لیے اسلام نظامِ عدل وقسط قائم کرنا چاہتا ہے' نہ صرف قانونی نظام بلکہ سماجی عدل بھی' تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ اللہ کی معرفت حاصل کریں۔ اس سے لو لگائیں' اس سے محبت کریں اور اپنے مقصدِ تخلیق کو

پورا کریں۔ اور یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ انہیں اس کے لیے فرصت ہو' وقت ملے اور یہ نہ کہہ سکیں کہ:

ع تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے!

اسلام کے معاشی نظام کے دو رُخ

اسلام کس قسم کا معاشی اور اقتصادی نظام قائم کرنا چاہتا ہے؟ اس کی وضاحت سے قبل اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ اسلام کے معاشی نظام کے دو رُخ یا دو پہلو ہیں' یا یوں سمجھئے کہ دو حصے ہیں' مگر اس طرح کہ دونوں اپنی اپنی جگہ ایک مکمل نظام کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ دونوں کا اپنا ایک فلسفہ ہے' اپنا نظریۂ ملکیت اور نظریۂ حقوق ہے اور اسی طرح دونوں کا اپنا نظریۂ قدرِ زائد ہے۔ معاشی نظام میں اہمیت رکھنے والی تمام چیزیں ان دونوں نظاموں میں جدا جدا ہیں اور اپنا جداگانہ فلسفہ رکھتی ہیں۔ سورۃ الرحمٰن کی آیۂ مبارکہ

﴿مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ﴿١٩﴾ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ﴿٢٠﴾﴾

''اُس نے دو دریا جاری کیے جو برابر چل رہے ہیں' مگر ان کے درمیان ایک غیر مرئی پردہ حائل ہے جو انہیں باہم مدغم نہیں ہونے دیتا۔''

کے مصداق اسی شکل میں یہ دونوں نظام موجود ہیں اور اسلام جو مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے وہ ان دونوں کے حسین امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔

خلط مبحث

ہمارے ہاں خلط مبحث ہوتا ہے اور ہر شخص اپنے نقطۂ نظر کے مطابق اسلام کے معاشی نظام کی تشریح و تعبیر کرتا ہے۔ جو لوگ سوشلزم اور کمیونزم سے متاثر ہیں وہ انفرادی ملکیت کی کامل نفی کرتے ہیں۔ ضرورت سے زائد ہر چیز چھین لینے کی بات کرتے ہیں اور دوسرا پہلو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں' مثلاً قانونِ وراثت بھی تو قرآن مجید میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ حضور اکرم ﷺ کے قائم کردہ نظام میں بھی جبری مساوات کی نفی کر دی گئی ہے۔ صرف یہی نہیں کہ جائز ذرائع سے کمائی ہوئی دولت پر تصرف کا حق ہے' بلکہ وراثتاً جائیداد کی منتقلی کا حق بھی تسلیم کیا گیا ہے۔

دوسری طرف وہ لوگ جو کمیونزم سے خار کھاتے ہیں اسلام کے قانونی نظام کا دم بھرتے ہیں' جبکہ اس کے رُوحانی نظام کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ انفرادی ملکیت کو اس قدر نمایاں کرتے ہیں کہ ایک استحصالی سرمایہ دارانہ نظام کا نقشہ آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل

یہ دونوں قسم کے نقطہ ہائے نظر کسی غلط فہمی کی بنیاد پر بھی پیدا ہو سکتے ہیں اور خلوصِ نیت کے ساتھ بھی۔ اسلام کے قرنِ اول میں بھی یہ غلط فہمی پیدا ہوئی' چنانچہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے جن پر زہد اور فقر کا غلبہ تھا ''آیہ کنز''(1) کو ظاہری معنوں پر محمول کیا اور اس رائے کا اظہار کیا کہ سونا چاندی اور سرمایہ ایک لمحے کے لیے بھی اپنے پاس رکھنا حرام ہے۔ اس سے ایک بڑا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ خلافتِ راشدہ نے ان کی اس رائے کو انتہا پسندانہ قرار دیا۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دَور میں انہیں مدینہ بدر کیا گیا اور مدینہ سے باہر ہی ان کا انتقال ہوا۔ انتقال کے وقت صرف ان کی اہلیہ محترمہ ان کے پاس تھیں۔ ان کے زہد کی شدت کا یہ عالم تھا کہ گھر میں ضرورت کی چند چیزیں تھیں' مگر ان کی موجودگی پر بھی پریشان تھے اور بار بار کہتے تھے: ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ تم اپنے گرد سانپ اور بچھو جمع کر لو گے اور یہ مجھے نظر آ رہے ہیں''۔ اہلیہ محترمہ نے کہا: ''کہاں ہیں وہ سانپ اور بچھو جو ہم نے جمع کر لیے ہیں؟'' تو فرمانے لگے: ''یہ دیکھو توا ہے' چمٹا ہے' دیگچی ہے' پہننے کے کپڑے ہیں' اور یہ سب سانپ اور بچھو ہی تو ہیں۔''

یہ صحیح ہے کہ اسلام قانونی نظام سے رُوحانی نظام کی طرف قدم بڑھانے کا تقاضا کرتا ہے' وہ چاہتا ہے کہ انسان اس کی طرف پیش قدمی کرے اور اسی بات سے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو کامل خلوص کے ساتھ مغالطہ لاحق ہوا' لیکن بدنیتی کے ساتھ بھی یہ

---

(1) ﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ (التوبة)

''اور وہ لوگ جو اپنے پاس سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے' تو ان کو دردناک عذاب کی بشارت دے دیجیے۔''

غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اخلاقی و رُوحانی نظام کے اصول

اسلام کے اخلاقی یا روحانی نظام کے چار اصول ہیں:

(۱) ملکیت کی کُلّی نفی۔

(۲) انسان کو جو کچھ ملتا ہے وہ اُس کا کسب نہیں بلکہ اللہ کا فضل ہے‘ اُس کی عطا ہے۔

(۳) انسان کا حق اُس کی جائز ضروریات ہیں۔ بعض احادیث میں حضور اکرم ﷺ نے انہیں متعین فرما دیا ہے‘ یعنی دو وقت کے کھانے کے لیے سامان‘ سر چھپانے کو چھت‘ دو جوڑے کپڑے اور عفت و عصمت کی حفاظت کے لیے بیوی۔

(۴) اب جو کچھ انسان کے پاس بچ رہے اسے دوسروں کی ضروریات کے لیے وقف کر دے۔ اگرچہ قانونی طور پر اسے اس پر حق تصرف حاصل ہے‘ لیکن اخلاقی تقاضا یہ ہے کہ وہ دوسروں کی طرف منتقل ہو۔

تو یہ اپنے طور پر ایک مکمل نظام ہے۔ اس میں نظریہ ملکیت بھی ہے اور اپنے حق کا تصرف بھی۔ نیز اگر قدر زائد ہے تو اس کا مصرف بھی موجود ہے۔

اخلاقی نظام میں ربا

قرآن مجید میں ربا کا لفظ دو چیزوں کے ضد کے طور پر آیا ہے:

(۱) ربا بمقابلہ بیع: ﴿وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ (البقرۃ: ۲۷۵)

(۲) ربا بمقابلہ صدقات اور تزکیہ نفس کے واسطے خرچ کرنے کے‘ جیسے ﴿وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۠ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ۝۳۹﴾ (الروم)

اسلام کی رُوحانی تعلیمات میں اسی مفہوم کے ساتھ سورۃ البقرۃ کی اس آیت — ﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ يُرْبِي الصَّدَقٰتِ﴾ (آیت ۲۷۶) ”اللہ ربا کو گھٹاتا اور صدقات کو بڑھاتا ہے“— میں صدقات کے مقابلے میں ربا کا لفظ آیا ہے۔ یوں سمجھئے کہ ایک انسان یا مثلاً ملازم پیشہ آدمی کی ضرورت پوری ہونے کے بعد کچھ سرمایہ اُس کے

پاس جمع ہو گیا ہے۔ اب اس فاضل سرمائے کے دو مصرف ہیں' یا تو وہ اسے کسی کاروبار میں لگائے۔ اس صورت میں اس کی محنت اس میں شامل نہیں ہو گی۔ اب اس اخلاقی نظام میں فاضل سرمائے سے جو بڑھوتری ہو گی وہ بھی ایک طرح سے ربا قرار پائے گی۔ اس کا صحیح مصرف یہ ہے کہ اسے محتاجوں اور مسکینوں میں تقسیم کر دیا جائے یا وہ لوگ جن کے پاس کاروبار کی بنیاد ڈالنے کے لیے سرمایہ موجود نہیں انہیں سرمایہ فراہم کیا جائے تاکہ وہ رزق حلال باعزت طریقے سے حاصل کرنے کے قابل ہو سکیں۔ ان کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر ان کی محنت میں سے حصہ وصول کرنا گو قانونی طور پر جائز بھی ہو' اخلاقی اور روحانی سطح پر یہ ممنوعات کی فہرست میں شامل ہو گا۔ اس لیے اس فاضل سرمائے کا مصرف یہ ہونا چاہیے کہ ضرورت منداس سے فائدہ اٹھائیں۔ اور اگر زیادہ نہیں تو انہیں یہ سرمایہ بطور قرضِ حسنہ ہی دے دیا جائے تاکہ وہ بھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں اور معاشرے میں صاحبِ عزت اور صاحبِ حیثیت بن سکیں۔ قرآن کی اخلاقی اور روحانی تعلیم کا یہی وہ نکتہ ہے جسے اپنا کر ایک جنتی معاشرہ تشکیل دیا جا سکتا ہے۔

عفو اور قصاص

اسلام کے اخلاقی اور رُوحانی نظام کا فرق و تفاوت بلکہ بعض اوقات تضاد صرف معاشی تعلیمات ہی میں نہیں بلکہ دوسرے قوانین میں بھی ہے۔ مثلاً مظلوم بدلہ لینے کا قانونی حق رکھنے کے باوجود معاف کر سکتا ہے اور اخلاق اور رُوحانیت کا تقاضا عفو و درگزر ہی ہے[1] جبکہ قانون قصاص لینے ہی میں خیر محسوس کرتا ہے اور اسی کی ترغیب دلاتا ہے۔[2]

---

(۱) ﴿وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (التغابن)
''اور اگر تم معاف کر دیا کرو اور چشم پوشی سے کام لو اور بخش دیا کرو تو اللہ بہت بخشنے والا' نہایت مہربان ہے۔''

(۲) ﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ (البقرة)
''اور اے ہوش مندو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے' تاکہ تم بچ سکو۔''

قانونی اور فقہی نظام

اس کے بعد آیئے اسلام کی قانونی معاشی تعلیمات کی طرف اور ان کے ضمن میں سمجھئے اسلام میں محنت کے تصور کو۔ اسلام کا قانونی معاشی نظام ایک طرح کا Controlled Capitalism ہے کہ اس میں تینوں جبلی تقاضے موجود ہیں۔ اس میں نجی ملکیت (private ownership) بھی ہے اور ذاتی دلچسپی بھی' اور ساتھ ہی ساتھ آزاد معیشت کا تصور بھی۔ البتہ اس میں حلال اور حرام کی تفریق موجود ہے۔ پابندی کمانے پر نہیں بلکہ حلال سے تجاوز کرنے پر ہے۔ ملکی قانون حقِ تصرف تسلیم کرتا ہے اور اپنی مرضی سے اللہ کی راہ میں دینے کا تقاضا بھی کرتا ہے۔ البتہ جو فرض ہے مثلاً زکوٰۃ وہ جبراً وصول کر لی جائے گی' لیکن زکوٰۃ کے علاوہ اس پر کوئی قانونی پابندی نہیں ہوگی۔ مگر ذہن میں رہے کہ اسلام نے اس قانونی نظام کو دو پہلوؤں سے حدود کا پابند کیا ہے تاکہ یہ ایک لعنت بن کر نوعِ انسانی پر مسلط نہ ہو جائے۔ ایک تو وہ خطوط متعین کیے گئے جن کی موجودگی میں سرمایہ کاری سرمایہ داری بننے سے محفوظ رہے۔ دوسری طرف آزاد معیشت میں بعض لوگوں کے آگے بڑھ جانے اور بعض لوگوں کے پیچھے رہ جانے کے امکان کو تسلیم کر کے جبری مساوات کی بجائے اس فرق و تفاوت کو بڑی حد تک ختم کرنے اور اس درمیانی خلا کو پُر کرنے کے لیے راستہ تجویز کیا گیا۔ نظامِ زکوٰۃ اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اسلام نے ایک حدِ فاصل قائم کر دی ہے کہ جو بھی اس حد سے آگے بڑھ جائیں وہ مال دار ہیں اور دینے کے مکلف ہیں' اور جو اس حد تک نہیں پہنچ سکے وہ مستحق اور ضرورت مند ہیں۔ معروف معنوں میں پہلے والوں کو haves اور دوسروں کو have nots شمار کر لیجیے۔ لیکن یہ تقسیم آپ کے اختیارات کے تابع نہیں کہ آپ جسے چاہیں have اور جسے چاہیں have not بنا دیں' بلکہ نصاب کی ایک حد مقرر کر دی گئی ہے کہ اتنے اونٹ یا اتنا سونا وغیرہ ہے تو دینے والوں کی صف میں اور اگر اس سے کم ہے تو لینے والوں کی صف میں۔ اس تقسیم کے بعد یہ اصول قائم کر دیا گیا: "تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَاءِ هِمْ وَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَاءِ هِمْ" یعنی (زکوٰۃ) اغنیاء سے لے کر مستحقین میں تقسیم کی جائے گی تاکہ اس تفریق کا کسی حد تک

ختم کیا جا سکے جو معاشرے میں پیدا ہو کر بہت سی برائیوں کا باعث بنے گی۔

ارتکازِ دولت

لیکن ایسا نہیں ہوگا کہ کچھ لوگ تو ارتکازِ دولت کر کے عیش و عشرت کی زندگی بسر کریں اور کچھ لوگ ضروریاتِ زندگی سے بھی محروم رہ جائیں۔ اسلام اجتماع و ارتکازِ دولت کا مخالف ہے' سرمائے کو گردش میں لانے کا متقاضی ہے' لیکن وہ سرمائے کی فطری گردش کے حق میں ہے۔ سرمائے کی مصنوعی گردش جو سرمایہ دارانہ نظام کا خاصہ ہے' اسلام کے نزدیک پسندیدہ نہیں۔ اس نے اصولاً یہ بات طے کر دی:

﴿كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ﴾ (الحشر)

''تا کہ دولت تم میں سے سرمایہ داروں کے مابین ہی اُلٹ پھیر میں نہ رہ جائے۔''

جیسے ایک کروڑ پتی کی بیٹی ایک دوسرے کروڑ پتی کے بیٹے سے بیاہی گئی' لاکھوں کا جہیز اس گھر میں جمع ہو گیا جہاں کروڑوں روپے پہلے سے موجود ہیں۔ سرمایہ تو گردش میں آیا مگر مصنوعی انداز میں اور معاشرے کو اس سے قطعاً کوئی فائدہ نہیں پہنچا اور یہ سرمایہ نچلے طبقات تک منتقل نہیں ہو سکا۔ اسی طرح ایک سرمایہ دار کے بیٹے کی سالگرہ پر لاکھوں روپے کے تحائف جمع ہو گئے۔ سرمایہ کی گردش کا عمل یہاں بھی وقوع پذیر ہوا لیکن بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ (سرمایہ داروں ہی کے درمیان)۔ اسلام کی منشا یہ ہے کہ معاشرے میں جو بھی ذرائع پیداوار ہیں (اور زمین سب سے بڑا ذریعہ پیداوار ہے) ان کی منصفانہ تقسیم ہو اور ان کا حاصل پورے معاشرے میں پھیلے۔ میں نے Controlled Capitalism کی جو اصطلاح استعمال کی ہے اب اسے Internally managed Capitalism کے الفاظ میں ادا کیا جا رہا ہے' کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام بھی یہ بات جان چکا ہے کہ ننگی اور عریاں سرمایہ داریت اس دَور میں نہیں چل سکتی۔ اس کا کوئی مستقبل نہیں' بلکہ وہ تو تباہی کی طرف لے جا رہی ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

کفالتِ عامہ

سرمایہ دارانہ نظام کُلی طور پر اپنے فلسفے کے ساتھ اب قابلِ قبول نہیں رہا۔ اس کا کوئی مستقبل نہیں اور وہ تباہی کے کنارے تک پہنچ چکا ہے۔ اس لیے اپنے تحفظ کے لیے قابلِ عمل اقدامات کر رہا ہے' جس کی نمایاں مثال برطانوی معاشرہ میں ملتی ہے۔ وہاں ان لوگوں کے لیے جو کام نہیں کر پاتے روزگار نہ ہونے کی صورت میں الاؤنس مقرر دیے گئے ہیں۔ اس طرح بنیادی ضروریات کی کفالت ریاست اپنے ذمے لے لیتی ہے' آزاد معیشت کا تصور بھی مجروح نہیں ہوتا اور ضرورت مند لوگوں کی کفالت کا سامان بھی کر دیا جاتا ہے' لیکن غور کیا جائے تو اسلام کے نظامِ معیشت میں یہ اصول چودہ سو سال پہلے طے کیا جا چکا ہے' جہاں سرمایہ دارانہ نظام یا بے خدا معاشرہ ٹھوکریں کھا کر اب پہنچ رہا ہے۔ اسلام چودہ سو سال پہلے یہ بتا چکا ہے کہ کمانے کھانے کی آزادی ہے اور آگے بڑھنے کی بھی' لیکن جو پیچھے رہ جائیں ان کی بنیادی ضروریات کی فراہمی معاشرے کا فرض ہے اور زکوٰۃ وعشر کا نظام اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

کفالتِ عامہ کے اصول کو Collective Insurance بھی کہا جا سکتا ہے' اس فرق کے ساتھ کہ انشورنس خواہ کسی قسم کی ہو اسے انسان اپنی کمائی میں بچت کر کے حاصل کرتا ہے' لیکن اسلام نے جو اصول وضع کیا ہے اس میں ایک طبقہ بچاتا ہے اور جمع کرتا ہے' لیکن ضروری نہیں کہ اس کا فائدہ بھی اُسے ہی پہنچے جس نے بچایا اور جمع کیا ہے' بلکہ ایک مال دار اور غنی ہے جو بچاتا اور جمع کرتا ہے اور دوسرا طبقہ جو ضرورت مند ہے اس سے اپنی ضرورت پوری کرتا ہے اور اس کی یہ کفالت نظامِ زکوٰۃ اور عشر کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ اب آیئے اسلام کے فقہی اور قانونی نظام میں کمائی میں حلال وحرام کی قیود کی طرف۔

حلال وحرام کی حدود

اسلام پہلی شرط حلال وحرام کی پاسداری کی عائد کرتا ہے تاکہ معاشرے میں یہ تمیز

الٹو جانے کے بعد جو طوفانِ بدتمیزی برپا ہوتا ہے اور انسانیت کی حیوانیت میں تبدیلی کا عمل شروع ہوتا ہے اس کا سدِ باب کیا جا سکے۔ اس کے بعد ان اقدامات پر نظر ڈالیے جو قرآن مجید اپنے معاشی نظام میں وضع کرتا ہے اور عش عش کیجیے۔ لیکن یہ وضاحت بہر حال ضروری ہے کہ قرآن مجید معاشیات کی کتاب نہیں ہے کہ اس نے عنوانات قائم کر کے معاشی اصطلاحات پر بحث کی ہو اور ایک ایک نکتے کی وضاحت ضروری سمجھی گئی ہو۔ تاہم کتاب ہدایت ہونے کی بنا پر قرآن مجید میں زندگی کے اس پہلو میں بھی رہنمائی کی گئی ہے۔ قرآن مجید نے جو ہدایات دی ہیں ان سب کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ اسلام اپنے قانونی نظام میں بھی زیادہ سے زیادہ محنت پر انحصار کرتا اور سرمایہ کو کم از کم اہمیت دیتا ہے۔ محنت اور سرمائے کے امتزاج سے معاشی ڈھانچہ کی تشکیل کو وہ تسلیم کرتا ہے' لیکن محض سرمائے کی بنیاد پر بغیر محنت کے کمائی کو وہ اچھا نہیں سمجھتا۔ اس کے نزدیک اصل چیز محنت ہے' سرمایہ نہیں۔ مثلاً اس کی بدترین صورت یہ ہے کہ کسی کاروبار میں سرمایہ لگانے والا شخص منافع میں شریک ہو لیکن نقصان میں حصہ دار نہ ہو' اور منافع کی بھی متعین شرح لینے پر مصر ہو تو یہ ایک انتہا پسندانہ سطح ہے جس میں وہ محض سرمائے کی حیثیت سے کمائی کا حق دار بنتا ہے۔ اس مثال سے چار امور سامنے آتے ہیں:

(۱) سرمایہ بحیثیت سرمایہ منافع کا مستحق ٹھہرا۔

(۲) اپنے تحفظ کی ضمانت۔

(۳) نقصان میں عدم شرکت۔

(۴) نفع کی ایک متعین شرح۔

جہاں یہ چاروں صورتیں جمع ہوں تو یہ ربا ہے اور اسلام نے اپنے نظامِ معیشت میں اس کی جڑ کاٹ دی ہے۔ زنا' شراب غرض کسی برائی کے بارے میں قرآن مجید نے وہ سخت لہجہ اختیار نہیں کیا جو ربا کے بارے میں اختیار کیا ہے۔ ربا کے بارے میں اس کی آتش غضب یوں بھڑکتی ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝﴾

﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ (البقرۃ)

''اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور سود میں سے جو باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو اگر تم واقعی مؤمن ہو۔ پھر اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو اللہ اور اس کے رسول کے مقابلے میں جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

اس قدر سخت وعید کسی اور معاملے میں نہیں آئی' اور اس کی بہترین وضاحت اور ہماری ذہنی سطح کے مطابق بات قرآن کے مزاج شناس اور اللہ کے پیارے رسول ﷺ نے یوں فرمائی:

((اَلرِّبَا سَبْعُوْنَ حُوْبًا اَیْسَرُھَا اَنْ یَّنْکِحَ الرَّجُلُ اُمَّہٗ))

(رواہ ابن ماجہ والبیہقی)

''ربا کے ستر جزو ہیں' اُن میں سب سے ہلکا یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی ماں سے نکاح کرے۔''

یہ انداز ہمیں ناگوار محسوس ہوتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ایسی تشبیہ کیوں اختیار کی' لیکن غور کریں تو اس کی حکمت روزِ روشن کی طرح ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ بعض چیزیں ایسی ہیں جن سے ہمیں طبعی طور پر نفرت ہے اور بعض چیزیں اس کے ہم پایہ برائی ہیں لیکن ہم انہیں جبلی یا طبعی طور پر برائی نہیں سمجھتے۔ جب کوئی شخص انہیں پہلی چیزوں کے مقابلے میں لائے گا اور ان سے تشبیہ دے کر بیان کرے گا تو حقیقت واضح ہو گی۔ یہی حکمت حضور ﷺ کے اس فرمان میں پوشیدہ ہے۔ تم شاید اسے جرم نہ سمجھو' یہ کہہ کر خود کو مطمئن کر لو کہ سود لے لیا تو کون سی برائی ہو گئی' یہ دراصل ماں سے نکاح کرنے کے مترادف ہے۔ گویا ہمارے نظامِ شریعت میں بدترین برائی ربا قرار پاتی ہے۔ نظامِ سرمایہ داری میں سب سے زیادہ اہمیت ہی سرمائے اور اس کے تحفظ کو ہے اور اسلام نے اسے ربا قرار دے کر اس کی جڑ ہی کاٹ دی ہے۔ اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ جس میں سرمایہ مارکیٹ کو کنٹرول کرتا ہے' اس کے اتار چڑھاؤ کا باعث بنتا ہے۔ ایک شخص دس لاکھ روپے سے اپنی مالی حیثیت کا تعین کراتا ہے۔ اب وہ سٹہ کھیلتا ہے۔ زبانی کلامی ہی خریدا اور بیچ دیا' لیا اور دیا۔ صرف اپنی مالی حیثیت کی بنا پر مارکیٹ میں اُتار چڑھاؤ پیدا

کرتا ہے' ورنہ حقیقت میں نہ کچھ لیتا ہے اور نہ دیتا ہے۔ کبھی یک دم مال خرید کر قیمتیں
چڑھا دیتا ہے اور کبھی مال ریلیز کر کے قیمتیں گھٹا دیتا ہے۔ یہ سب سرمائے کا کھیل ہے۔
سرمایہ منڈی سے کھیل رہا ہوتا ہے۔ کراچی سٹاک ایکس چینج میں یہ دلچسپ صورتِ حال
دیکھی جا سکتی ہے کہ نظری طور پر سودے ہو رہے ہیں' نہ کچھ لینا اور نہ کچھ دینا۔ پاگلوں کی
طرح چیخ پکار ہوتی ہے اور سیٹھوں' ساہوکاروں کو اطلاع دینے کے لیے دوڑتے ہیں۔ یہ
منڈی کا اتار چڑھاؤ ہو رہا ہوتا ہے اور سرمایہ داروں کا کھیل۔

اسی ضمن میں انشورنس آتی ہے۔ ان سب چیزوں کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے۔
انشورنس میں دو پہلو ہیں جو حرمت لیے ہوئے ہیں' ایک تو جوا ہے اور دوسرا سرمائے کے
تحفظ کی ضمانت۔ اس بات کو ایک مثال سے سمجھئے۔ ایک شخص دس لاکھ روپے سے ماچس
بنانے کا کارخانہ قائم کرتا ہے اور دس لاکھ روپے کی انشورنس کراتا ہے۔ اس کا سرمایہ
آفاتِ سماویہ کی زد میں ہے۔ کوئی اتفاقی حادثہ' آگ یا سیلاب اس کارخانے کو تباہ کر سکتا
ہے۔ لیکن وہ اپنے سرمائے کا تحفظ یوں کرتا ہے کہ اس کی انشورنس کرواتا ہے۔ اور دُوسرا
ظلم یہ کرتا ہے کہ یہ تحفظ اپنی جیب پر بوجھ ڈال کر حاصل نہیں کرتا بلکہ اس کا سالانہ پریمیم
بھی جو وہ ادا کرتا ہے لاگت میں شمار کرتا ہے۔ ماچس کی ایک ڈبیہ پر وہ پریمیم کی لاگت
ڈالتا ہے اور صارف سے اس کی قیمت وصول کرتا ہے' صرف اس لیے کہ کسی حادثے کی
صورت میں اس کا سرمایہ محفوظ ہو جائے۔ جہاں تک اجتماعی مفاد کا تعلق ہے ہمارا ایک
ملک ایک قوم ہے' جس کے مادّی مفادات مشترک ہیں۔ تباہی تو آ گئی اور دس لاکھ روپے
کا سرمایہ ملکی سطح پر ضائع ہو گیا' لیکن سرمایہ دار اس نقصان میں سے ایک پائی بھی برداشت
کرنے کے لیے آمادہ نہیں اور خریدار کا خون چوس کر اپنے سرمائے کا تحفظ کرتا ہے۔ یہ
سرمایہ داروں کی امداد باہمی کا نظام ہے جو اپنے سرمائے کا تحفظ کر رہے ہیں۔ اس کی حرمت
کے لیے اسلام نے قطعی فیصلہ کر دیا ہے: ﴿كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ﴾۔

ایک دائرہ اور بھی ہے جس میں بعض چیزیں حلال اور بعض حرام ہیں اور بعض وہ
ہیں جن کی حلت و حرمت میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان چیزوں کو ہم ایک ہی گروپ

میں لاتے ہیں۔ ایک شخص محنت کر سکتا ہے، صحت مند اور محنتی ہے، لیکن اس کے پاس سرمایہ موجود نہیں۔ اس کے برعکس ایک دوسرا شخص ہے جس کے پاس سرمایہ موجود ہے۔ یہ دونوں مل کر کاروبار کرتے ہیں۔ ایک شخص سرمایہ فراہم کرتا ہے اور دوسرا اس میں اپنی محنت شامل کرتا ہے۔ اس محنت اور سرمائے کے امتزاج کو مضاربت کہتے ہیں۔ یہ اسلام میں جائز ہے لیکن پسندیدہ نہیں۔ جس طرح طلاق جائز ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز۔ اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ جس کے پاس صرف اس قدر سرمایہ ہے کہ وہ اپنی ضرورت ہی پوری کر سکتا ہے تو وہ خود کاروبار کرے اور اپنی ضروریات پوری کرے، لیکن اگر اس کے پاس کوئی دوسرا ذریعہ آمدنی موجود ہے، مثلاً وہ ملازمت کرتا ہے تو اس کے پاس جو ضرورت سے زائد سرمایہ ہے وہ اپنے مجبور بھائی کو دے دے اور اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اس کی محنت میں سے حصہ نہ بٹائے۔

مضاربت میں بھی شرط رکھی گئی ہے کہ نقصان کا پورا بوجھ سرمائے پر پڑے گا اور محنت کش ایک پائی کے نقصان میں بھی شریک نہیں ہوگا۔ اسلام نے محنت کے تحفظ کو منافع کا جائز ذریعہ قرار دیا ہے۔ اس صورت میں وہی مضاربت جائز ہوگی جس میں نقصان کی پوری ذمہ داری سرمایہ فراہم کرنے والا شخص برداشت کرے اور منافع میں وہ محنت کش کا ساجھی ہو۔ لیکن یہ وضاحت دوبارہ کر لی جائے کہ اسلام کے نزدیک یہ عمل بھی پسندیدہ نہیں۔ اس کا پسندیدہ طریقہ یہ ہے کہ اصل زائد سرمایہ رکھنے والا شخص یہ سرمایہ کسی دوسرے ضرورت مند مسلمان بھائی کو بطور قرضِ حسنہ دے تاکہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے اور اس کی خوشحالی قومی خوشحالی میں حصہ دار بنے۔ اس سے اجتماعی زندگی میں حسن پیدا ہوگا۔ اگر آپس کے معاملات مجبوری میں طے پائیں تو یہ حسن کہاں پیدا ہوگا! قرآن مجید بیع کو بھی باہمی رضامندی سے مشروط کرتا ہے: ﴿عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ﴾ (النساء: ۲۹) یعنی تمہاری رضامندی سے۔

مثال کے طور پر آپ کو ایک جوتا خریدنا ہے۔ آپ مارکیٹ میں گھومیں پھریں۔ آپ کو اندازہ ہے کہ اس وقت ایک معیاری جوتے کی قیمت سوسوا سو روپے ہے۔ آپ

ہوتے ہیں تو اس میں کسی مجبوری کا دخل نہیں ہوتا۔ آپ سمجھتے ہیں کہ اس وقت لاگت اس قدر ہے۔ اس پر منافع کی شرح اندازاً یہ ہوگی۔ یہ باہمی رضامندی کا سودا ہے۔ لیکن کوئی ایسا معاملہ جس میں کوئی شخص کسی مجبوری کے تحت ایسا کر رہا ہو ناپسندیدہ ہے۔ اگر چہ سرمایہ رکھنے والا شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ صاحب وہ میرے پاس اپنی خوشی سے آیا ہے اور سرمایہ لے کر کاروبار کرنے کی صورت میں اس کے منافع میں مجھے شریک کرنے کی پیشکش کی ہے' اس میں کسی مجبوری کو کوئی دخل نہیں —— لیکن حقیقتاً اس کی مجبوری کو اس میں دخل ہے۔ اگر اس کے پاس سرمایہ موجود ہو تو وہ کسی کو اپنے خون پسینے کی کمائی میں کیوں شریک کرے گا؟ یہ مضاربت کی وہ شکل ہے جو قانونی طور پر حلال ہے لیکن اسلام اسے پسند نہیں کرتا۔

مزارعت

اسی قبیل کی ایک چیز مزارعت بھی ہے۔ ایک شخص کی زمین ہے' دوسرا اس پر محنت کرتا ہے اور اس کی پیداوار میں زمیندار کو شریک کرتا ہے۔ صنعتی انقلاب کے بعد مشین اور دوسری چیزیں یا معدنیات بھی ذرائع پیداوار میں شامل ہو گئیں۔ لیکن قدیم ترین ذریعہ پیداوار زمین ہی ہے اور زمین کے بارے میں بقول علامہ اقبال اسلام کا انقلابی نظریہ یہ ہے: ؎

رزقِ خود را از زمیں بردن رواست
ایں متاعِ بندہ و مِلکِ خداست!

مزارعت کے بارے میں ہمارے ہاں اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اسے حرام مطلق (۱) کہتے ہیں' وہ کسی نوع کی مزارعت اور غیر حاضر زمینداری کو جائز نہیں سمجھتے۔ دوسرے فقہاء نے احادیث پر ذرا غور کر کے کچھ ایسے پہلو نکالے ہیں جس سے کچھ گنجائش پیدا ہوتی ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ وہ اُس دور کے خاص حالات تھے۔ مصالح مرسلہ یا استحسان کے اصول کے تحت ایسی گنجائش نکالی گئی' ورنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

(۱) ایسا معاملہ فقہی اصطلاح میں ''عقدِ فاسد'' کہلاتا ہے۔

نے تو مزارعت پر لفظ ربا استعمال کیا ہے۔

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا کہ ان کے پاس کوئی زمین نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ سے کہیں باہر جا رہے تھے' دیکھا کہ رافع ایک کھیت کو پانی لگا رہے ہیں۔ آپؐ نے ان سے دریافت فرمایا کہ کھیتی کس کی ہے اور زمین کس کی ہے؟ انہوں نے عرض کیا: کھیتی میری ہے' بیج میں نے ڈالا ہے اور محنت بھی میں نے کی ہے' جبکہ زمین بنی فلاں کی ہے۔ پیداوار ہمارے درمیان نصف نصف تقسیم ہوگی۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اَرْبَیْتُمَا)) (تم دونوں نے ربا کا معاملہ کیا ہے) ''یہ زمین اس کے مالک کو لوٹا دو اور جو کچھ اس پر تمہارا خرچ ہوا ہے وہ تم اس سے لے لو''۔ اس لیے کہ اس زمین میں اُس کی کون سی محنت شامل ہے جس کا وہ معاوضہ لے رہا ہے؟ صرف اس وجہ سے کہ زمین کا مالک ہے وہ اپنے بھائی کی گاڑھے پسینے کی کمائی سے حصہ وصول کر رہا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مزارعت کے بارے میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا فتویٰ آنکھیں کھول دینے والا ہے اور ہمیں اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ویسے تو یہاں ملک کی نوے فی صد آبادی حنفیوں پر مشتمل ہے' لیکن ایسے اہم معاملات میں امام ابوحنیفہ کا فتویٰ کوئی ماننے کے لیے تیار نہیں۔ ویسے تو انہیں امام اعظم کہا اور مانا جاتا ہے اور سید الفقہاء بھی' لیکن جہاں ان کا فتویٰ اچھا نہیں لگتا اسے اٹھا پھینکنے اور دیوار پر دے مارنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ یہ ہماری دو عملی ہے جس پر ہمیں غور کرنا چاہیے۔ مزارعت اور مضاربت کو ہم نے تیسرے درجے میں رکھا ہے۔

اب آیئے چوتھی صورت کی طرف' کہ جو مال موجود نہ ہو اس کے بیع کی جو شکل بھی ہوگی اسلام میں حرام ہوگی۔ یہ جتنے ایڈوانس سودے ہو رہے ہیں' یہ تمام معاملات جن میں سرمایہ کھیلتا ہے ان سب کے دروازے بند کر دیے گئے ہیں۔ بیع وہ ہے کہ مال موجود ہے اور قیمت ادا کر دی گئی یا دو چیزیں ہیں جن کا تبادلہ ہو گیا۔ ایک ہاتھ سے دیا دوسرے ہاتھ سے لیا' یہ بیع ہے اور اس میں بھی باہمی رضامندی (عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ) ضروری

ہے۔ اگر مجبوری سے فائدہ اٹھایا گیا ہے' اگر کہیں مصنوعی قلت کے ذریعے سے ریٹ بڑھا دیے گئے ہیں' اگر کہیں کوئی اور کھیل کھیلا گیا ہے تو اس میں حرمت کا پہلو شامل ہو جائے گا۔ ہمارے ہاں جو سودے بازی ہوتی ہے کہ زمین آپ نے ٹھیکے پر دی ہے' اب چاہے کسان کو کچھ بچے نہ بچے آپ کا ٹھیکہ محفوظ ہے' باغ میں ابھی پھل نہیں آیا اس کا سودا ہو گیا ہے یہ سب حرام مطلق ہے۔ ہمارے دین میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ اُدھار کی شکل میں صرف ایک سودا جائز ہے جسے بیع سلم کہتے ہیں۔ دو چیزوں کا بالکل تعین ہو جائے اور ان میں سے ایک چیز کا ملأ دے دی جائے یہ بیعِ سَلم ہے۔ ہمارے ہاں یہ ہوتا ہے کہ فلاں چیز فلاں وقت لے لوں گا اور یہ بیعانہ لے لیجیے۔ اگر وقت پر وہ چیز نہ دے سکا تو بیعانہ ہضم۔ اب یہ بیعانہ کس کھاتے میں ہضم ہو رہا ہے؟ وہ سودا تو پورا ہو نہیں پایا۔ یہ ساری چیزیں درحقیقت اس وجہ سے ہمارے ہاں رواج پا گئی ہیں کہ ہمارے یہاں شریعت کوئی ایک حاکمہ کی حیثیت سے ہے ہی نہیں' مارکیٹ میں جو رواج چلا وہ ہم نے اختیار کر لیا۔

اوور ٹریڈنگ

ایک شخص کے پاس پانچ لاکھ روپے ہیں اور وہ اوور ٹریڈنگ میں پچاس لاکھ روپے کا مال لے لیتا ہے تو اسلام میں اسے ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ اگر آپ کے پاس پانچ لاکھ روپے ہیں تو پانچ لاکھ کا سودا کر لیجیے' پانچ لاکھ اسی وقت آپ کو دے دینا ہوں گے۔ اس ادائیگی کو بیع سلم کہتے ہیں۔ بیع کے ضمن میں بھی حدود قائم کر دی گئی ہیں اور ان سب کا مقصد یہی ہے کہ سرمائے کو زیادہ کھل کھیلنے کا موقع نہ ملے۔ اسی سلسلے میں میری زندگی کا ایک یادگار واقعہ ہے کہ میں اسی شہر لاہور کے ایک بڑے دارالعلوم میں ایک عالم دین سے ملنے گیا۔ شیخ الحدیث ہیں' حدیث کا درس دے رہے تھے' میں بھی بیٹھ گیا۔ مشکوٰۃ شریف کی ایک حدیث زیر درس تھی جو کئی طرق سے آئی ہے: ((لَا یَبِعْ حَاضِرٌ لِبَادٍ)) یعنی کوئی کسی جگہ کا رہنے والا شخص باہر سے آنے والے کے مال کو فروخت نہ کرے۔ درس مکمل ہو گیا' موجودہ کاروبار کے بارے میں کوئی ریفرنس نہ آیا۔ ہمارے معاشرے میں بیع و شراء کے جو طریقے ہیں اس پر کوئی بحث نہ ہوئی۔ میں نے سوال کیا: ''حضرت!

ہمارے ہاں جو آڑھت کا کاروبار ہوتا ہے اس حدیث کی روشنی میں اس کا حکم ہے؟'' انہوں نے مجھ سے سوال کیا: ''یہ آڑھت کیا ہوتی ہے؟'' اب یہ تجاہل عارفانہ تھا یا فی الواقع انہیں معلوم نہیں تھا' واللہ اعلم! میں نے جب تشریح کی کہ یہاں کچھ لوگ منڈیوں میں دکانیں اور اڈے بنا کر بیٹھتے ہیں' باہر سے کاشت کار اناج اور سبزیاں لے کر مختلف منڈیوں میں آتے ہیں اور یہ آڑھتی ان کا مال فروخت کرتے ہیں اور اپنا کمیشن لیتے ہیں۔ ان کا جواب تھا کہ ''یہ تو مطلقاً حرام ہے۔''

اب اندازہ کیجیے کہ یہ فیصلہ کتنا قطعی ہے۔ اس میں بھی لوگوں نے حلال کے بہت سے پہلو نکال لیے ہیں کہ دوطرفہ آڑھت کا حکم تو یہی ہے' لیکن اگر ایک طرف کمیشن لیا جائے تو وہ حرام نہیں ہوگا' اس لیے کہ یہ دوسری شکل ہو جاتی ہے' گویا وہ خریدار کی طرف سے وکیل بن گیا' جو وکالت کر کے اس کی طرف سے مال کا خریدار ہے' اس طرح وہ اپنی وکالت کی اُجرت لے رہا ہے۔ جس میں اس کے لیے حلت کا پہلو پیدا ہو گیا ہے۔ اس تاویل میں بھی کسی بدنیتی کو دخل نہیں' لیکن میں عرض کروں گا کہ ہمارے ہاں فقہاء نے اصول ایسے بنائے ہیں کہ جو عمومِ بلویٰ ہو یعنی کوئی چیز عام ہوگئی ہو یا زمانے کا ایک خاص چلن بن جائے اور اب اس کو بالکل ختم کرنا ممکن نہ ہو تو اسے مصالح مرسلہ کہہ لیں یا استحسان' بہرکیف ایسی چیزوں کے بارے میں فقہاء نے لوگوں کے لیے آسانی کی گنجائش پیدا کی ہے۔ مختصراً یہ کہ اس کے اندر جو حلت کا پہلو نکالا گیا ہے وہ یہ ہے کہ دوطرفہ آڑھت کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ حرامِ مطلق ہے اور ہمارے ہاں اجناس' سبزیوں اور گوشت کا جو کاروبار ہوتا ہے وہ اس دوطرفہ آڑھت ہی کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ مثلاً گوشت کی قیمتوں کو کنٹرول کرنے کی کوشش ہوتی ہے تو قصائی شور مچاتے ہیں کہ ساری مصیبت ان آڑھتیوں کی ڈالی ہوئی ہے جو اصل مہنگائی کا باعث ہیں۔ اس میں خرابی درخرابی یہ ہے کہ آڑھتی اپنا سرمایہ ایڈوانس کرتا ہے اور اس طرح پابندی لگاتا ہے کہ اپنا مال میرے ذریعے فروخت کرو گے۔ یہ خالص ربا ہے کہ کسی نے کوئی رقم کسی کو دی اور اس رقم سے چاہے کوئی گن کر نقد معاوضہ نہیں لیا لیکن دوسرے کو اس کا پابند کیا کہ وہ اپنا مال اس کے

اور یہ فروخت کرے گا۔ یہ درحقیقت ربا ہے' یہ گندگی ہے اور ''ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ'' کا مصداق ہے۔ بیع کے بارے میں ان حدود و قیود کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ اسلام نے اپنے فقہی و قانونی نظام میں بھی ایسے اقدامات کیے ہیں کہ سرمائے کو زیادہ کھل کھیلنے کا موقع نہ ملے۔

رومن امپائر کے عہد میں کرنسی ایجاد ہوئی تھی۔ انسان کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کتنی بڑی مصیبت اپنے سر پر مسلّط کر رہا ہے۔ جب تک یہ کرنسی کا تصور نہیں تھا دنیا میں لین دین ہو رہے تھے' لیکن تبادلے کی بنیاد پر تھے۔ اجناس کا تبادلہ تھا۔ ایک شخص نے کھیت میں کام کیا اور فصل پیدا کی۔ دوسرا شخص کرگھے پر بیٹھا ہوا کھدر بنا رہا ہے' دونوں اپنی ضرورت کے مطابق تبادلہ کر لیتے۔ اس میں ذخیرہ اندوزی نہیں ہوتی تھی۔ وہ کتنی گندم اکٹھی کر لے گا؟ لیکن جب سونے کو معیّن کر دیا گیا کہ ایک تولہ سونا مساوی ہے اتنے گز کپڑے کے یا اتنے من گندم کے تو کرنسی کی لعنت درمیان میں آ گئی۔ اب سرمایہ داری کا آغاز ہوا۔ آپ نے اپنی تجوری میں فرض کیجیے دس سیر سونا رکھا ہوا ہے' اب آپ کو موقع مل گیا' آپ جس طرح چاہیں مارکیٹ سے کھیلیں' جس طرح چاہیں اونچا نیچا کر لیں' جس طرح چاہیں کنٹرول کریں۔ یہ اس سرمایہ کی لعنت ہے جس میں اصل چیز کرنسی ہے۔ اس کرنسی نے یہ سارے امکانات پیدا کیے۔ سرمائے کی اپنی ایک فارم ہے' جبکہ آج کل کی اصطلاح میں مکان اور انسانی محنت بھی سرمایہ ہے' لیکن انسان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے والی فارم کرنسی نے یہ ساری مصیبتیں انسان پر لادی ہیں' ورنہ انسانی ضرورت آپس کے تبادلہ سے پوری ہو سکتی ہے۔ اس میں خواہ مخواہ تعریف کا پہلو تلاش نہ کیا جائے تو یہ ایک حقیقت ہے کہ اشتراکی ممالک میں اس وقت جو معاشی ضروریات آپس کے تبادلہ سے پوری کی جاتی ہے اور کرنسی کا عمل دخل کم سے کم ہے' انسان ٹھوکریں کھا کر وہاں پہنچ رہا ہے جہاں نبی اکرم ﷺ نے اور اللہ تعالیٰ کی کتاب نے چودہ سو سال پہلے پہنچا دیا تھا: ((لَا يَبِعْ حَاضِرٌ لِبَادٍ))۔ ایک شخص نے گندم پیدا کی ہے وہ آ کر خود بیچے اور اگر کسی کے پاس دس ہزار روپیہ ہے وہ اس دس ہزار کی گندم خرید کر بیچے۔ لیکن اگر ایک شخص اڈہ

بنا کر بیٹھ جائے اور اس اڈہ کی بنا پر کماتا ہے تو یہ حرام ہے۔ یہ حدود وہ ہیں جن سے سرمایہ کاری سرمایہ داری نہیں بنتی' سرمایہ کینسر بن کر مسلط نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ کچھ اضافی اقدامات بھی ہیں۔ جو دولت بھی مرتکز ہوگئی ہے اسے تقسیم کرنے کے لیے' گردش میں لانے کے لیے وراثت کے احکام ہیں۔ اسلام کا رجحان ارتکازِ دولت کی طرف نہیں بلکہ تقسیم دولت کی طرف ہے اور وراثت اس میں ایک اہم رول ادا کرتی ہے۔

اس طرح سے اس میں دو چیزیں مزید شامل کر لیجئے۔ انسانی کمزوریوں کو exploit کر کے کمانا۔ جنس انسان کی بہت بڑی کمزوری ہے۔ اس کے اس جنسی جذبے کو مشتعل کر کے کمانا حرامِ مطلق قرار دیا گیا اور ہمارے ہاں فلم انڈسٹری کا کاروبار اسی بنیاد پر ہے۔ اس لیے میں نے اس کو کمزوری کہا ہے۔ قرآن مجید نے بھی شرم گاہ کے لیے لفظ فوج استعمال کیا ہے' یعنی ''اندیشے کی جگہ''۔ فصیل میں جہاں دراڑیں پڑ جائیں' جہاں سے ایک غنیم کو اندر آنے کا موقع مل سکتا ہے وہ ''فرج'' ہے۔ چنانچہ اعضائے جنسی کو بھی قرآن حکیم فرج سے تعبیر کرتا ہے کہ انسانی شخصیت کی فصیل میں یہ سب سے بڑی اندیشے کی جگہ ہے' اس کا کمزور پہلو ہے' یہاں سے اس پر بڑی جلدی سے حملہ کیا جا سکتا ہے۔ شراب کی حرمت اور فحاشی کے کاروبار پر قدغن کی یہی حکمت ہے۔ انسان اگر دولت' دولت کے لیے کماتا ہے تو اس میں ایک بہت بڑا عنصر اس کی عیاشی کرنے کی خواہش ہوتا ہے' لیکن اسلام نے عیاشی کے دروازے ہی بند کر دیے ہیں۔ اب ایک انسان سرمائے کو لے کر کیا کرے گا؟ آخر وہ سرمایہ کاہے کے لیے ہے؟ اس طریقے سے سرمائے کے ساتھ attachment کم کر دی گئی ہے۔

اسلام نے سرمایہ داری پر مختلف پہلوؤں اور مختلف اطراف سے حملے کیے ہیں اور ان سب کا حاصل یہ ہے کہ اس نے اپنے قانونی نظام میں نجی ملکیت (private ownership) کی صورت بھی برقرار رکھی ہے۔ ذاتی دلچسپی کو بروئے کار لانے کا موقع دیا ہے۔ گویا کھلا بھی چھوڑ دیا ہے' محنت بھی کرو' کوشش بھی کرو' بھاگ دوڑ کرو' کھیت میں خوب محنت سے ہل چلاؤ' پسینہ بہاؤ۔ جو کچھ نکلے گا تمہارا ہے' اس پر کوئی ظلم اور

جبر کے ساتھ قبضہ نہیں کر سکے گا۔ اس میں سے جو حق معین ہے وہ دے دو۔ اس حق معین کے ذریعے تو کفالتِ عامہ کا بندوبست ہو گیا کہ have not اور have کی تقسیم زیادہ نہ بڑھنے پائے اور کوئی بھی بنیادی ضروریات سے محروم نہ رہ جائے۔ یہ وہ نقطہ عدل ہے کہ آزادی بھی برقرار رہے اور مساوات بھی۔ اس کے علاوہ اسلام کے نظام میں یہ گنجائش بھی ہے کہ اگر کسی موقع پر زکوٰۃ اور عشر کے ذریعے سے حاصل شدہ رقوم سے کفالتِ عامہ کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں تو جبری ٹیکس وصول کرنے کا اختیار ہے۔ یعنی حق ملکیت کو بھی کسی طرح کا تقدس عطا نہیں کیا گیا جو کسی سرمایہ دار نظام میں ہوتا ہے' بلکہ وہاں اس ریاست کو جو غرباء و مساکین کی کفیل ہے یہ حق حاصل ہے کہ اگر اس کی ضروریات کسی وقت اتنی بڑھ جائیں یا کوئی ایمرجنسی کی صورت ہو' مثلاً جنگ شروع ہو گئی' قحط نے آلیا اور صرف زکوٰۃ و عُشر سے کفالت کے تقاضے پورے نہیں ہوتے تو حکومت مزید بھی لے سکتی ہے۔ دوسری طرف اگر کسی کاروبار کو پبلک سیکٹر میں دینے سے عدل کے تقاضے پورے نہیں ہوتے تو ریاست کو نیشنلائزیشن کی بھی اجازت ہے' کیونکہ اصل قدر عدل ہے۔ مثلاً اجارہ داری ہے' کسی چیز کا صرف ایک ہی کارخانہ ہے۔ اب مالک کے لیے یہ موقع ہے کہ جو وہ قیمت چاہے وصول کرے اور لوگ دینے پر مجبور ہیں۔ اس صورت میں چونکہ تقاضائے عدل پورا نہیں ہوتا' لہٰذا اس صنعت کو قومی ملکیت میں لینے کی پوری آزادی ہے۔

حضرت عمرؓ کے دور میں عراق کی زمینیں فتح ہوئیں۔ (یہ بات آپ کے ذہن میں رہنی چاہیے کہ عراق اور شام کا علاقہ انتہائی زرخیز ہے۔) فتوحات کے بعد مطالبہ کیا گیا کہ یہ زمینیں فوج میں تقسیم کر دی جائیں' اس لیے کہ یہ مالِ غنیمت ہے۔ اس پر تنازعے کی صورت پیدا ہوئی۔ دونوں طرف سے دلائل دیے گئے تو حضرت عمرؓ کی اجتہادی بصیرت نے فیصلہ دیا کہ اس طرح عدل کے تقاضے پورے نہیں ہوں گے۔ بلکہ یہ سب ریاست کی ملکیت ہوں گی اور اس پر کام کرنے والے موروثی مزارع کی حیثیت سے کام کرتے رہیں گے' البتہ اسلامی ریاست لگان وصول کرے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اگر یہ فیصلہ نہ فرماتے تو اسلام کے ذریعے دنیا میں بدترین جاگیرداری نظام رائج ہو جاتا' کیونکہ ان فوجیوں کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ قانون کے ڈھانچے میں بھی غرباء کی مصلحت کو پیش نظر رکھا گیا۔ بجائے سرمایہ کے محنت کو اتنا تحفظ دیا گیا کہ اگر کہیں نقطہ عدل بحال نہ رہے تو اسے نجی ملکیت سے نکال کر قومی تحویل میں لے لیا جائے۔ اس کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اجتہاد چمکتا ہوا سورج ہے۔

اسلامی ریاست میں دونوں نظام علیحدہ علیحدہ نہیں ہوتے' یہ بیک وقت ہوتے ہیں اور اسلام کی برکات کا ظہور صرف قانونی نظام سے نہیں ہو پائے گا جب تک کہ معاشرے میں کچھ ایسے لوگ موجود نہ ہوں جو ایمانی اور رُوحانی سطح پر زندگی بسر کریں' کیونکہ معاشرے کی اقدار کو کنٹرول یہی لوگ کرتے ہیں۔ ہمارے موجودہ معاشرے میں اصل قدر دولت اور سرمایہ ہے۔ جس کے پاس دولت اور سرمایہ ہے اسے بڑے سے بڑا شخص جھک کر ملے گا۔ لیکن روحانیت کے عَلم برداروں کے ہاں یہ بات نہیں۔ وہ جو سلطان الہند نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ جیسے گدڑی پوش درویش ہیں اور گویا اسلام کی ایمانی و روحانی تعلیمات کا مظہرِ اَتم ہیں' انہیں دنیا کی کسی شے سے رغبت نہیں۔ وہ دنیا کی کسی چیز کی ملکیت اختیار کر کے فخر کرنے والے نہیں۔ دن بھر کی ضرورت کے لیے دال روٹی اور سر چھپانے کے لیے ایک چھت میسر ہے تو بس اس سے زیادہ کسی مزید چیز کے حصول کی خواہش نہیں۔ مال وزر کے انبار انہیں قطعاً متاثر نہیں کرتے۔ جب تک معاشرے میں ایسے لوگ موجود نہ ہوں جو اس اعلیٰ سطح پر زندگی بسر کرتے ہوں اور وہ آیت ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ۭ﴾ کا نمونہ بن جائیں' محض قانونی اقدامات سے معاشرے کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ اس لیے معاشرہ میں ایک ایسا طبقہ موجود رہنا چاہیے جس سے معاشرتی اقدار کا تعین ہوتا ہے' جس سے وہ ایمانی حقیقت سامنے آتی رہتی ہے کہ اصل مسئلہ معاش کا نہیں معاد کا ہے' اصل چیز دولت نہیں نیکی ہے' عمل صالح ہے' اللہ کا نام ہے اور اُس کے رسول کا اتباع اور ان کی محبت ہے۔ یہ اقدار اگر معاشرے میں روشنی کے مینار کی طرح بالفعل موجود نہ ہوں تو اسلام کی برکات کا کامل ظہور کبھی نہیں ہو سکتا۔

اس بات کو ایک ناگزیر ضرورت کی حیثیت سے سامنے رکھیے کہ یہ نقشہ بھی معاشرے میں موجود رہنا چاہیے' ابوذر غفاریؓ موجود رہنے چاہئیں — اور ابوذرؓ تو ایک انتہا کو پہنچ گئے تھے' وہ فقراءِ صحابہ اور اصحابِ صُفّہ رضی اللہ عنہم بھی تو معاشرے کے اندر موجود تھے' انتہائی مسکین روکھی سوکھی کھانے والے' جنہوں نے سب کچھ اللہ اور اس کے رسول کی راہ میں دے دیا تھا' جیسے حضرت ابوالدرداء' حضرت مقداد اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہم وغیرہ۔ ایسے لوگوں کے متعلق جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جن کے چہرے غبار آلود ہوتے ہیں' لیکن اللہ کے ہاں ان کا مقام یہ ہے کہ اگر کسی بات پر اللہ کی قسم کھا بیٹھیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسموں کی لاج رکھے گا۔ یہ ہے ہمارے روحانی نظام کا ایک نقشہ۔ اگر یہ موجود نہ ہو تو محض قانونی نظام ہمارے مسائل کا حل نہیں۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جس نے مکہ کی زمین کا کرایہ لیا اس نے سود کھایا۔ چونکہ لوگ حج کی ادائیگی کے لیے مکہ آنے پر مجبور ہیں' لہٰذا یہاں کے پروہت اور پنڈت کئی ہزار روپے ایک چھوٹے سے کمرے کے چند دنوں کے لیے وصول کرتے ہیں اور یہ سب ان کے نزدیک حلال ہے اور اس پر عیش کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ان کی ساری دولت پہلے بیروت میں عیاشیوں اور فحاشیوں پر خرچ ہوتی تھی' اب لندن' پیرس اور امریکہ میں خرچ ہوتی ہے۔ اگر صرف قانونی حیلہ بازیوں پر اکتفا کیا جائے تو یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ اس لیے قانونی اور روحانی نظام کے حسین امتزاج سے ہی اسلام کا معاشی نظام ترتیب پاتا ہے' اور جہاں ان دو کی یکجائی ہو تب کسی نظام کو اسلام کا معاشی نظام کہا جا سکتا ہے۔ یہ ہیں چند نکات جن کی روشنی میں ایک اسلامی فلاحی معاشرہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

ع گر یہ نہیں تو بابا پھر سب کہانیاں ہیں!

خاکسار **اسرار احمد** عفی عنہ

۲۴/اگست ۱۹۸۲ء

اسلام کا نظامِ محاصل

از: ڈاکٹر اسرار احمد

یہ مقالہ بتاریخ ۱۱ جنوری ۱۹۷۹ء ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل لاہور میں جسٹس ذکی الدین پال صاحب کی صدارت میں منعقدہ لائنز کلب لاہور کے سالانہ اجلاس میں پڑھا گیا۔

اَحمدہٗ واُصلّی علیٰ رسُولہ الکریم۔ امّا بعدُ

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم صدرِ مجلس وصدر واراکینِ لائنز کلب اور معزز حاضرین!

سب سے پہلے تو میں آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے اس منفرد اور منتخب مجلس کو خطاب کرنے کا موقع دیا۔ میں اسے اپنے لیے ایک اعزاز متصور کرتا ہوں اور اس پر آپ کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرتا ہوں۔

البتہ یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مجھے گفتگو کے لیے جو موضوع آپ نے دیا ہے اس میں کسی قدر ناانصافی کا معاملہ ہوا ہے' میرے ساتھ بھی اور موضوع کے ساتھ بھی۔ اس لیے کہ میں نہ معاشیات کے میدان کا آدمی ہوں نہ مالیات کا' اور محاصل کا مسئلہ نہایت فنی نوعیت کا حامل اور بے حد پیچیدہ ہونے کے علاوہ بیک وقت معاشیات و مالیات دونوں سے متعلق ہے ـــــ ایک ایسا ہی لطیفہ حال ہی میں اور بھی ہوا ہے اور وہ یہ کہ جناب سید نزہت بخاری صاحب (چیف ایگزیکٹو حیدری انٹرنیشنل فائی نینس لمیٹڈ) نے حال ہی میں ایک مقالہ پڑھا جس کا موضوع تھا:

"Tax on income vs tax on produce and possession."

لیکن لطیفہ یہ کہ یہ مقالہ پیش کیا گیا پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ کی شعبہ جاتی انجمن یعنی مجلس فلسفہ کے عہدیداروں کی حلف برداری کی تقریب میں۔ گویا وہاں موضوع کے اعتبار سے مقرر درست تھا لیکن سامعین غلط تھے۔ یہاں مقرر تو یقیناً بالکل غلط ہے' البتہ سامعین کے بارے میں میں کچھ کہہ نہیں سکتا! بہرحال میں نے یہ گمان کیا کہ میرا انتخاب موضوع کے جزوِ ثانی کے اعتبار سے ہوا ہے' یعنی: ''System of Taxation in Islam'' میں سے مجھ پر نگہ انتخاب اسلام کے ایک ادنیٰ خادم اور قرآن حکیم کے حقیر طالب علم ہونے کی بنا پر پڑی ہے اور میرے لیے یہ بھی یقیناً ایک بڑا اعزاز ہے۔ بہرحال میں کوشش کروں گا کہ اصل روحِ دین اور نظامِ اسلام دونوں کے اعتبار سے اسلام میں نظامِ محاصل کے بارے میں جو کچھ میں سمجھ پایا ہوں' آپ کے سامنے رکھ دوں!

''Taxation in Islam'' کے الفاظ سے آپ سے جو حقیقت ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس اصطلاح کے وضع کرنے والوں کے نزدیک اسلام ایک ایسے نظامِ معیشت کا علمبردار ہے جس میں ذاتی ملکیت (private ownership) اور آزاد معیشت (free-enterprise) کو اصولِ موضوعہ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس لیے کہ اجتماعی یا قومی ملکیت کے اصول پر مبنی نظام معیشت میں تو سب کچھ حکومت ہی کی ملکیت پر ہوتا ہے' لہٰذا محاصل کا مسئلہ ہی پیدا نہیں ہوتا!

میں آغازِ گفتگو ہی میں عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ میرے نزدیک یہ مفروضہ جزءً اتو درست ہے کُلّیۃً صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے اور اس سے پوری حقیقت سامنے نہیں آتی!

میرے نزدیک نظامِ معاشی کے اعتبار سے اسلام کے دو رخ یا دو پہلو ہیں' اور یہ دونوں ایک دوسرے پر بہت حد تک interdependent ہیں اور اسلام کی برکات و ثمرات کا کامل ظہور ان دونوں کے اتصال واجتماع ہی سے ہو سکتا ہے۔ اور یہ کہنا ہرگز غلط نہ ہوگا کہ اگر ان میں سے ایک پہلو نگاہوں سے اوجھل رہ جائے اور توجہ صرف ایک ہی پر مرتکز ہو جائے تو اس سے جو تصویر سامنے آئے گی وہ بہت بعید از حقیقت ہوگی۔ ان دو

پہلوؤں سے میری مراد یہ ہے کہ اسلام کا ایک اخلاقی و روحانی نظام ہے اور دوسرا قانونی و فقہی نظام۔ ان دونوں کے تقاضے بسا اوقات مختلف ہی نہیں متضاد ہوتے ہیں' تاہم ان دونوں کے امتزاج ہی سے اسلام کا کامل نظام وجود میں آتا ہے۔ آپ چاہیں تو ان دونوں پہلوؤں کو ''دعویٰ'' (thesis) اور ''جوابِ دعویٰ'' (anti-thesis) سے تعبیر فرمالیں اور ان دونوں کے امتزاج کو synthesis قرار دے لیں' بہرحال ان کے وجود سے انکار ممکن نہیں ہے! ایک چھوٹی اور سادہ سی مثال سے بات واضح ہو جائے گی۔ کوئی شخص آپ کے ایک تھپڑ مار دے تو اگر آپ بالکل عاجز و کمزور نہیں ہیں' اس لیے کہ اس صورت میں تو ''قہر درویش بر جانِ درویش'' کے سوا اور کوئی صورت قابل عمل ہی نہیں ہوتی' اس کے برعکس اگر آپ بدلہ لینے پر قادر ہیں تو آپ کے سامنے دو راستے کھلے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ بدلہ لیں اور دوسرے یہ کہ آپ معاف کر دیں۔ اسلام کا قانونی و فقہی نظام بدلے اور قصاص کی حوصلہ افزائی کرتا ہے' چنانچہ قرآن حکیم فرماتا ہے: ﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ (البقرۃ:۱۷۹) یعنی ''اے ہوش مندو! تمہارے لیے قصاص ہی میں زندگی ہے!'' لیکن دوسری طرف اسلام کی اخلاقی و روحانی تعلیمات ہیں جن کا تقاضا یہ ہے کہ زیادتی کرنے والے کو معاف کر دیا جائے' چنانچہ کہیں ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾ (البقرۃ:۲۳۷) ''اگر معاف کر دو تو یہ تقویٰ اور خدا ترسی سے قریب تر ہے''۔ کہیں تشویق و ترغیب کے انداز میں فرمایا جاتا ہے: ﴿وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ﴾ (آل عمران:۱۳۴) ''وہ لوگ جو غصہ کو پی جائیں اور لوگوں کو معاف کر دیا کریں!'' —— دیکھ لیجیے کہ عفو و قصاص ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں' لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ انسانی معاشرہ ان میں سے صرف ایک پر استوار ہو سکتا ہے۔ دونوں اپنے اپنے مقام و محل پر لازم و ناگزیر ہیں اور حسنِ معاشرت ان دونوں کے امتزاج ہی سے وجود میں آتا ہے۔

اسی پر قیاس کر کے سمجھ لیجیے کہ اسلام کے معاشی نظام کے بھی دو پہلو ہیں' چنانچہ ایک جانب اسلام کا قانونی اور فقہی نظامِ معیشت ہے جس کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ

ہوگا کہ یہ ایک نوع کی محدود سرمایہ داری (Controlled Capitalism) ہے۔ اس لیے کہ اس میں انفرادی سرمایہ کاری کی اجازت موجود ہے' اگرچہ اسے ''سرمایہ داری'' بننے سے بعض تحدیدی اقدامات نے روک دیا ہے۔ دوسری جانب اسلام کا اخلاقی و روحانی نظامِ معیشت ہے جس کے بارے میں میں پورے انشراحِ صدر سے عرض کرتا ہوں کہ وہ ایک نہایت اعلیٰ قسم کی روحانی اشتراکیت (Spiritual Socialism) ہے' اور ایسا کامل سوشلزم ہے کہ اس سے آگے کا تصور بھی ممکن نہیں۔ اس لیے کہ سوشلزم یا کمیونزم میں تو پھر بھی انسانی ملکیت کا اثبات موجود ہے' اگرچہ انفرادی نہیں اجتماعی' لیکن اسلام اپنی اخلاقی و روحانی اور صحیح تر الفاظ میں ایمانی تعلیم کی رو سے انسانی ملکیت کی کُلّی نفی کرتا ہے' چنانچہ قرآن حکیم میں بار بار یہ الفاظ آتے ہیں: ﴿لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ﴾ (البقرۃ: ۲۸۴) ''آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے ان سب کا مالک صرف اللہ ہے!'' انسان کسی اور شے کا مالک تو کیا ہوگا' خواہ وہ زمین ہو' مکان ہو' ساز و سامان ہو' روپیہ پیسہ ہو' وہ تو خود اپنا اور اپنے وجود کا مالک بھی نہیں۔ اس کے ہاتھ' پاؤں' اعضاء و جوارح اور جسم و جان اور اس کی کل توانائیاں سب اللہ کی ملکیت ہیں' اور وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہے کہ میں ان کا امین ہوں' بقول شیخ سعدیؒ : ؎

ایں امانت چند روزہ نزدِ ماست
درحقیقت مالکِ ہر شے خداست

یا بقول علامہ اقبال :

رزقِ خود را از زمیں بردن رواست
ایں متاعِ بندہ و مِلکِ خداست!

اسلام کے اس روحانی سوشلزم کی رو سے' جس کا آغاز انسانی ملکیت کے تصور کی کلی نفی سے ہوتا ہے' اس دنیا میں انسان کا حق صرف اس کی ضروریات ہیں اور بس!! ضرورت سے زائد اس کے پاس جو کچھ ہے اس پر اس کو قانونی وفقہی حق حاصل ہو تو ہو حقیقی حق کوئی حاصل نہیں۔ یہ دراصل دوسروں کا حق ہے جسے اللہ نے صرف بطورِ امتحان

اس کے تصرف میں دے دیا ہے تا کہ دیکھے کہ آیا وہ اسے حق داروں تک پہنچا کر اور ''حق بحقدار رسید'' والا معاملہ کر کے سرخرو ہوتا ہے یا دوسروں کے حق پر قبضہ مخالفانہ جما کر بیٹھ رہتا ہے اور اس ''قدرِ زائد'' کے بل پر ابنائے نوع پر دھونس جماتا ہے اور شادیوں اور دوسری تقریبات میں اس غصب شدہ دولت کو اللّوں تللّوں میں اڑا کر محروموں کے زخمی دلوں پر اور نمک چھڑکتا ہے!!— اب جن کے دلوں میں ایمان واقعتاً راسخ ہو جاتا ہے اور اللہ اور آخرت پر ان کا یقین محکم قائم ہو جاتا ہے اور ان کی نگاہ ہر دم ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَ﴾ (البقرۃ) پر جمی رہتی ہے' ان کی روش لامحالہ پہلی ہوتی ہے' جس کو قرآن نے واضح کیا ان الفاظ میں: ﴿وَيَسۡـَٔلُوۡنَكَ مَاذَا يُنۡفِقُوۡنَ ؕ قُلِ الۡعَفۡوَ ؕ﴾ (البقرۃ:۲۱۹) ''(اے نبی ﷺ!) وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں؟ (یعنی اللہ کی راہ میں کس حد تک دے ڈالیں؟) کہہ دیجیے جو بھی زائد از ضرورت ہو!'' اور جس کی طرف علامہ اقبال نے اشارہ کیا اپنے اس شعر میں کہ ۔

جو حرفِ ''قُلِ الۡعَفۡوَ'' میں پوشیدہ تھی اب تک
اِس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار!

پھر یہ بھی کہ اسے اپنا کوئی احسان نہ سمجھو' بلکہ یہ تو تھا ہی دوسروں کا حق۔ بمصداق الفاظِ قرآنی: ﴿وَالَّذِيۡنَ فِىۡۤ اَمۡوَالِهِمۡ حَقٌّ مَّعۡلُوۡمٌ ۙ لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ ۙ﴾ (المعارج) ''اور جن کے مالوں میں معین حق ہے' سائلوں اور محروموں کا!'' اور ﴿وَاٰتِ ذَا الۡقُرۡبٰى حَقَّهٗ وَالۡمِسۡكِيۡنَ وَابۡنَ السَّبِيۡلِ﴾ (الاسراء:۲۶) ''اور ادا کرو قرابت داروں اور مسکینوں اور مسافروں کو ان کا حق!''— اس کے برعکس جو لوگ اس کائنات اور خود اپنی ذات و حیات کی اصل حقیقتوں سے بالکل بے خبر ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں ان کی روش دوسری ہوتی ہے' جس کا اوّلین نتیجہ ہے اسراف اور انتہائی منزل ہے تبذیر!!— اسراف کہتے ہیں جائز ضرورتوں پر ضرورت سے زائد خرچ کرنے کو اور یہ بھی بہت معیوب ہے۔ جبکہ تبذیر ہے بالکل بلا ضرورت صرف نمود و نمائش اور اللّوں اور تللّوں میں روپیہ اڑانا اور یہ وہ جرم ہے جس کے مرتکبوں کو شیطانوں کے بھائی قرار دیا گیا۔ بمصداق الفاظِ

قرآنی: ﴿اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ﴾ (الاسراء:۲۷) ''یقیناً فضول خرچی کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں''۔ اعاذنا اللّٰہ من ذٰلک!

الغرض اسلام کی روحانی واخلاقی یا ایمانی تعلیمات کا حاصل اعلیٰ ترین اور عظیم ترین اور ہر اعتبار سے کامل ترین Spiritual Socialism ہے۔ لیکن یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے۔ دوسرے رُخ کے اعتبار سے اسلام کا نظامِ معیشت یقیناً ایک Controlled Capitalism ہے۔ اس لیے کہ اسلام قانونی وفقہی اعتبار سے افراد کو زمین' مکان' ساز وسامان حتیٰ کہ ذرائع پیداوار تک پر ایسا حقِ تصرف عطا کرتا ہے جو کم از کم ظاہری اعتبار سے حقِ ملکیت سے کامل مشابہت رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ حقِ تصرف یا حقِ ملکیت وراثتاً اولاد و اَحفاد کو منتقل بھی ہو سکتا ہے۔ الغرض اپنے قانونی وفقہی نظام میں اسلام نے انسان کے جبلی تقاضوں کو بتمام وکمال ملحوظ رکھا ہے اور نجی ملکیت (private ownership)' ذاتی حوصلہ مندی (personal incentive) اور آزاد معیشت (free-enterprise) کے اصولِ سہ گانہ کو قانونی سطح پر برقرار رکھ کر ''سرمایہ کاری'' کے لیے وسیع میدان پیدا کر دیا ہے۔ البتہ اس ضمن میں بعض نہایت اہم' بنیادی اور حد درجہ مؤثر احتیاطی تدابیر ایسی اختیار کی ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ معاشرے میں ''صحت مند سرمایہ کاری'' کی فضا تو قائم رہے' لیکن یہ ''سرمایہ داری'' کی صورت اختیار نہ کر لے۔ ان احتیاطی یا تحدیدی تدابیر کے بارے میں تفصیلی بحث میری موجودہ گفتگو کے موضوع سے خارج ہے' صرف اشارتاً عرض کر سکتا ہوں کہ سود (interest)' سٹہ (speculation) اور احتکار (hoarding) وغیرہ کی حرمت کی اصل غرض وغایت یہی ہے جو میں نے بیان کی' یعنی سرمایہ کاری' سرمایہ داری نہ بن جائے' اور Capitalism بہر حال controlled رہے' — البتہ اس حقیقت سے انکار صرف ہٹ دھرمی ہی سے کیا جا سکتا ہے کہ سرمایہ کاری خواہ کتنی ہی پابند کیوں نہ ہو فرق وتفاوت کو لازماً جنم دے گی اور اس سے اغنیاء (haves) اور فقراء (have-nots) کا وجود میں آنا ناگزیر ہے۔ اس لیے کہ اگر کسی دوڑ میں دس افراد شریک ہوں اور خواہش یہ ہو کہ

وہ سب برابر رہیں' نہ کوئی آگے بڑھے نہ پیچھے رہے تو اس کی تو ایک ہی صورت ممکن ہے' یعنی یہ کہ ان سب کو ایک رسے سے باندھ دیا جائے۔ بصورتِ دیگر تو لامحالہ کوئی آگے بڑھے گا اور کوئی پیچھے رہ جائے گا! گویا اسلام کے قانونی وفقہی نظام میں 'جبری مساوات' (forced equality) کا کوئی وجود نہیں ہے۔ لیکن اتنی ہی بڑی اور اہم حقیقت یہ بھی ہے کہ اسلام کے نظامِ محاصل میں اسی فرق و تفاوت کے مسئلے سے عہدہ برآ ہونے کے مقصد کو اوّلین اور مقدم ترین اہمیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اغنیاء اور فقراء کی تقسیم کو اعتباری یا عارضی (arbitrary) نہیں رہنے دیا بلکہ اس کے لیے ایک باقاعدہ وباضابطہ حدِ فاصل کھینچ دی ہے جسے اصطلاحِ شرع میں ''نصاب'' کہتے ہیں' جس کا تعین اموال کی تقریباً تمام بڑی بڑی صورتوں میں کر دیا گیا ہے۔ مثلاً ساڑھے سات تولے یا اس سے زائد سونے کا مالک اغنیاء میں شمار ہوگا اور ساڑھے سات تولے سے کم رکھنے والا فقراء میں سے ___ اور اسلام کے نظامِ محاصل کا ایک اہم رکن یعنی زکوٰۃ اغنیاء سے لی جائے گی اور فقراء میں تقسیم کر دی جائے گی' بقول نبی اکرم ﷺ ((تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَائِهِمْ وَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَائِهِمْ)) (متفق علیہ) اور اس طرح وہ تمام تقاضے بتمام وکمال اور باحسن وجوہ پورے ہو جاتے ہیں جنہیں اس دور میں ''اجتماعی ضمانت'' (collective insurance) یا سماجی تحفظ (social security) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اور اس سب پر مستزاد ہے وہ روحانی و اخلاقی اور ایمانی و احسانی تعلیم جو اسلام اپنے ہر ماننے والے اور قرآن اپنے ہر پڑھنے والے کو مسلسل دیتا ہے کہ لذّاتِ دنیوی اور تعیش و تنعم سے کنارہ کشی اختیار کرو۔ اپنی ضروریات کو کم سے کم کرو' اور حقیقی اور واقعی ضروریات سے جو بھی زائد ہو' اسے اللہ کی راہ میں دے دو اور یہ نہ سمجھو کہ مال میں واحد حق زکوٰۃ ہی ہے۔ یہ تو کم از کم اور ناگزیر قانونی ضابطہ ہے۔ ایمان کا اصل تقاضا و مطالبہ اس سے بہت آگے ہے۔ بموجب فرمانِ نبوی ﷺ: ((اِنَّ فِي الْمَالِ لَحَقًّا سِوَى الزَّكَاةِ)) (رواہ الترمذی و ابن ماجہ) ''یقیناً مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی بہت سے حقوق ہیں''۔ اور اچھی طرح جان لیجیے کہ نظامِ اسلامی کا اصل حسن و جمال اور اس کی

اصل برکات اُس کی اسی دوسری اور تکمیلی تعلیم و تلقین میں مضمر ہیں!!

اسلامی نظمِ مملکت میں نظامِ محاصل کے بارے میں ایک اہم اور اصولی بات اور بھی ہے جو مدِ نظر رہنی ضروری ہے' اور وہ یہ کہ اسلامی ریاست اصلاً ایک نظریاتی ریاست ہے اور اگرچہ اس کی حدود میں بسنے والے تمام شہری بلا امتیازِ مذہب و ملت بعض اعتبارات سے بالکل مساوی بھی ہیں' جیسے حرمتِ جان و مال میں' تاہم بہت سے اعتبارات سے شہریوں کا دو حصوں میں منقسم ہونا لازم و لابد ہے۔ یعنی ایک وہ جو اس نظریے کو ماننے والے ہوں جس پر ریاست قائم ہے اور دوسرے وہ جو اسے نہ مانتے ہوں۔ چنانچہ اسلام کے نظامِ محاصل کے اعتبار سے بھی ایک اہم اور بنیادی تقسیم اسی اعتبار سے ہے کہ بعض کی ادائیگی صرف مسلمانوں پر ہے' یعنی اسلامی ریاست کے اصول و مبادی کے ماننے والوں پر اور بعض کی غیر مسلموں پر یعنی ان پر جو ان اصولوں کو نہیں مانتے۔ پھر یہ کہ ان دونوں کی نوعیت میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہے اور ان کے مداتِ صَرف میں بھی اساسی اور بنیادی فرق ہے۔ چنانچہ مسلمانوں سے نقدی کی تمام صورتوں اور اموالِ تجارت پر زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے جس کی شرح کُل مالیت کا اڑھائی فیصد ہے۔ ان کی زرعی اراضی میں سے نہری یا چاہی زمینوں کی کُل پیداوار کا بیسواں حصہ وصول کیا جاتا ہے یعنی پانچ فیصد' اور بارانی زمینوں کی پیداوار سے کل کا دسواں حصہ وصول کیا جاتا ہے یعنی دس فیصد — اور ان دونوں کی نوعیت ٹیکس کی نہیں ہے بلکہ اصلاً عبادت کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شرح بھی بالکل معین ہے جس میں کسی ردّ و بدل کی گنجائش نہیں ہے' ورنہ ان کی حیثیت عبادت کی نہیں رہے گی بلکہ صرف ایک ٹیکس کی رہ جائے گی۔ اسی طرح ان کی مداتِ صَرف بھی معین ہیں' ان کے علاوہ کسی مد میں انہیں صَرف نہیں کیا جا سکتا' جن کا مجموعی حاصل وہ اجتماعی ضمانت یا سماجی تحفظ ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے!

اس کے برعکس غیر مسلموں کے اموال سے جزیہ وصول کیا جاتا ہے اور ان کی زمینوں سے ''خراج'' اور ان دونوں کی حیثیت خالصتاً ٹیکس کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کوئی شرح بھی معین نہیں' ان کا تعین حکومتِ وقت کی صوابدید پر ہے اور اسی طرح ان

سے حاصل شدہ رقوم کے صرف پر بھی کوئی پابندی نہیں' جملہ شعبہ ہائے حکومت کے اخراجات اور نظم و انصرامِ مملکت کے تمام تقاضے ان سے پورے کیے جا سکتے ہیں۔ (۱)

اسلامی حکومت کی آمدنی کا ایک اور شعبہ جس کی شرح معین ہے' وہ اموالِ خُمس ہیں' یعنی پانچواں حصہ یا بیس فیصد جو اموالِ غنیمت' کنز یعنی دفینے' اور رکاز یعنی معدنیات سے وصول کیا جاتا ہے۔ ان کی جس طرح شرح وصولی زکوٰۃ و عشر کی طرح معیّن ہے اسی طرح مداتِ صرف بھی صرف وہی ہیں جو زکوٰۃ اور عشر کی۔ اس فہرست میں صرف ایک اور شق کا اگر اضافہ کر لیا جائے تو ایک پہلو سے بات مکمل ہو جائے گی اور وہ یہ کہ زکوٰۃ اور عشر کے علاوہ جو صدقاتِ نافلہ مسلمان اپنی مرضی سے فی سبیل اللہ دیں ان کے بارے میں انہیں اختیار ہے کہ چاہے از خود فقراء و مساکین میں تقسیم کر دیں چاہے اسلامی حکومت کے حوالے کر دیں (بخلاف زکوٰۃ اور عشر کے کہ وہ لازماً حکومت ہی کو ادا کرنے ہوں گے!) اگر وہ ایسی رقوم بھی حکومت کے حوالے کر دیں تو وہ بھی صرف ان ہی مدات میں صرف ہوں گی جن میں زکوٰۃ اور عُشر کی رقوم کا صرف جائز ہے۔

اس کے بعد نمبر آتا ہے اسلامی حکومت کے عام محاصل کا' جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

---

(۱) ایک نہایت اہم اور قوی اور فقہ حنفی کی رو سے نہایت محکم رائے یہ بھی ہے کہ پاکستان کی جملہ اراضی ''خراجی'' کے حکم میں ہیں نہ کہ ''عشری'' کے حکم میں۔ گویا اگر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی مزارعت کے مطلقاً حرام ہونے کی رائے کو کسی وجہ سے چھوڑ کر صاحبین یعنی قاضی ابو یوسف اور امام محمد شیبانی کی رائے پر عمل کیا جائے تو بھی پاکستان کی جملہ اراضی کے کاشت کار براہِ راست ریاست پاکستان کے ''مزارع'' ہوں گے اور ان کا ''خراج'' براہِ راست خزانہ عامرہ میں جمع ہوگا' جس سے taxation کے پورے نظام میں انقلاب آ جائے گا اور غالباً انکم ٹیکس کی تو سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ اس موضوع پر پروفیسر رفیع اللہ شہاب صاحب کی ایک مختصر تحریر اس کتابچہ کے آخر میں درج کی جا رہی ہے۔ پروفیسر صاحب اپنے بعض نظریات کی بنا پر ہمارے دینی حلقوں میں شدید ''متنازعہ'' شخصیت بن چکے ہیں' لیکن ہمیں تو ہدایت ہے کہ ''انظروا الی ما قال ولا تنظروا الی من قال'' یعنی یہ دیکھو کہ کہا کیا جا رہا ہے' اسے نظر انداز کر دو کہ کہنے والا کون ہے! لہٰذا اس معاملے میں ان کی رائے پر جملہ اہلِ علم کو غور کرنا چاہیے۔ (اسرار احمد)

(۱) فَے: یعنی وہ اموال جو غیر مسلموں سے جنگ کے سوا کسی اور طریق سے حاصل ہوں۔ اپنی اصل کے اعتبار سے جزیہ اور خراج بھی فَے ہی کی قسمیں ہیں' لیکن عرفِ عام میں یہ لفظ ان اموال پر بولا جاتا ہے جو حاصل تو متحارب غیر مسلموں (Hostile Non-Muslims) سے ہوئے ہوں' لیکن ان میں فی الواقع جنگ اور خونریزی کی نوبت نہ آئی ہو۔

(۲) کراء الارض: یعنی حکومت کی مملوکہ اراضی سے حاصل شدہ لگان۔

(۳) عشور: یا درآمدی و برآمدی محصولات جن کے بارے میں ایک زمانے میں شرح کا تعین کچھ اس طرح ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کے اموال میں سے اڑھائی فیصد' اسلامی حکومت کے غیر مسلم شہریوں یعنی ذمیوں کے اموال میں سے پانچ فیصد اور دوسرے غیر مسلموں سے دس فیصد لیا جاتا تھا۔ لیکن یہ شرحیں کسی نص پر مبنی نہیں ہیں اور ان میں بھی کمی بیشی ہو سکتی ہے' جس میں ظاہر ہے درآمد و برآمد کے کاروبار کے توازن اور عالمی منڈی کے اتار چڑھاؤ کو اصل دخل حاصل ہوگا!

(۴) ضرائب: یعنی وہ مزید ٹیکس جو حکومت حسبِ ضرورت شہریوں پر عائد کر سکتی ہے۔ عام حالات میں بھی اگر دفاع اور نظمِ مملکت کی ضروریات اور فقراء کی احتیاجات مندرجہ بالا تمام مدوں سے پوری نہ ہو رہی ہوں اور خاص اور ہنگامی حالات میں بھی' جیسے زمانۂ جنگ یا قحط سالی یا کسی عمومی depression کے باعث عام بے روزگاری وغیرہ' تو ایسی صورتوں میں اسلامی حکومت کو اغنیاء پر ٹیکس لگانے کا غیر محدود اختیار حاصل ہے۔

(۵) اموالِ فاضلہ: یعنی متفرق آمدنی جیسے کوئی شہری اگر لاوارث فوت ہو تو اس کی کُل جائیداد اسلامی حکومت کی ملکیت قرار پاتی ہے۔ اسی طرح کوئی مسلمان مرتد ہو جائے تو اس کا کل مال بھی بیت المال میں داخل ہو جاتا ہے' اور اگر کوئی غیر مسلم شہری بغاوت کا مرتکب ہو جائے تو اس کی کُل میراث بھی اسلامی حکومت کا حق ہے۔

(۶) اوقاف: وقف اگر کسی خاص اور متعین مقصد کے لیے ہوں تو ان کی آمدنی انہی مصارف پر خرچ ہوگی' لیکن اگر کوئی شہری عام فی سبیل اللہ وقف کرتا ہے تو گویا وہ اسلامی

حکومت کی ملکیت شمار ہوگا اور اس کی کل آمدنی بیت المال میں شامل کی جائے گی۔

ان محاصل میں سے فَے‘ اموالِ فاضلہ اور عام اوقاف تو کُل کے کُل بیت المال میں داخل ہوں گے‘ جن کے ضمن میں کسی شرح کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا‘ البتہ کراء الارض‘ ضرائب اور عشور کی حیثیت taxes کی ہے اور ان کی شرح وقتاً فوقتاً تبدیل کی جاسکتی ہے جیسے بھی ضرورت داعی ہو۔ اسی طرح ان کی حاصل شدہ آمدنی کے صرف پر بھی کوئی پابندی نہیں۔ یہ انتظامِ مملکت کے اخراجات اور رفاہِ عامہ‘ عمومی فلاح و بہبود اور public works سب پر خرچ کی جاسکتی ہے۔ اگرچہ ایک رائے یہ ہے کہ ضرائب اور عشور میں سے بھی جو رقوم مسلمانوں سے حاصل ہوں گی ان کی مداتِ صرف بھی صرف وہی ہوں گی جو زکوٰۃ‘ عشر اور صدقات کی ہیں۔

اس تفصیل سے ایک جانب تو وہ حقیقت بالکل مبرہن ہوگئی جو پہلے عرض کی جاچکی ہے‘ یعنی یہ کہ اسلامی نظم مملکت میں taxation کے اعتبار سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مابین بڑا بنیادی فرق ہے‘ اور یہ فرق فطری بھی ہے اور عقلی و منطقی بھی۔ اس لیے کہ ایک غیر مسلم کے لیے اسلامی حکومت بس ایک امن و امان اور نظم و نسق قائم رکھنے والے ادارے کی حیثیت رکھتی ہے اور بس! جبکہ ایک مسلمان کے نزدیک اسلامی حکومت زمین پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی نمائندہ ہوتی ہے‘ اور اس کا مقصد صرف دنیوی فلاح و بہبود ہی نہیں ہوتا‘ اُخروی فوز و فلاح بھی ہوتا ہے‘ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ قائم ہی ہوتی ہے نظریۂ اسلامی کی ترویج و اشاعت اور دنیا میں اسلام کی تبلیغ اور غلبہ و اقامت کے لیے۔ اس لیے اس کی خیر خواہی و وفاداری اور اس کا بقاء و استحکام مسلمان کے عین دین و مذہب کا تقاضا ہے۔ چنانچہ وہ اس کو اپنی کمائی یا اللہ کے فضل میں سے جو کچھ دیتا ہے‘ اسے عبادت سمجھ کر دیتا ہے۔ اس کے اس تصور کو مزید تقویت حاصل ہوتی ہے‘ اس حقیقت سے کہ ان کی فرضیت‘ اور شرح ادائیگی اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی طرف سے ہیں۔ حکومت وقت صرف جمع کرنے والی (collector) اور تقسیم کرنے والی (distributor) ہے‘ نہ کہ عائد کرنے والی۔ اور عدمِ ادائیگی یا ادائیگی میں کتمان و

فریب صرف قانون کی خلاف ورزی ہی نہیں ہے بلکہ گناہ اور معصیت ہے' جس کا وبال ابدی اور اُخروی زندگی میں بھگتنا پڑے گا۔

دوسری حقیقت یہ بھی واضح ہوگئی کہ مسلمان شہریوں سے اسلامی حکومت کو جو کچھ وصول ہو اس میں سے اکثر کا اوّلین مصرف اس خلیج کو پاٹنا ہے جو اسلام کے قانونی وفقہی نظام میں موجود آزاد معیشت کا لازمی نتیجہ ہے' خواہ وہ کم ہو یا بیش!

تیسری اہم حقیقت جو دنیا کے دوسرے اکثر نظام ہائے ٹیکسیشن سے مختلف ہے وہ یہ کہ اسلام کا غالب رجحان یہ ہے کہ ٹیکس کے لیے اساس و بنیاد نہ فرد بحیثیت فرد ہو' جس پر poll یا capitation tax عائد کیا جاتا ہے' نہ آمدنی ہو جس پر income tax کی بنیاد ہے' نہ وسعتِ خرچ یا capacity to spend ہو' بلکہ کُل پیداوار یا ملکیت (total produce or possession) ہو' جیسا کہ زکوٰۃ یا عُشر یا خُمس سے ظاہر ہوتا ہے۔ ٹیکس عائد کرنے کی ان دوسری اساسات کے مقابلے میں اسلام کی اختیار کردہ یہ اساس کن مصلحتوں پر مبنی ہے' یہ ایک دقیق فنی مسئلہ ہے' تاہم اس ضمن میں ایک کوشش تو سید نزہت بخاری صاحب نے اپنے اس مقالے میں کی ہے جس کا ذکر میں آغاز میں بطور لطیفہ کر چکا ہوں۔ ان کی تحقیق کا لب لباب یہ ہے کہ انکم پر ٹیکس عائد کرنے سے افراطِ زر یا inflation کا رجحان بڑھتا ہے جبکہ 'total produce or possession' پر ٹیکس عائد کرنے سے اس کا قلع قمع ہوتا ہے۔ میں ایک غیر فنی انسان کی حیثیت سے ان کی دلیل کو پورے طور پر سمجھ نہیں پایا' تاہم یہ ایک اہم خیال ہے جو ایک واقف حال شخص نے ظاہر کیا ہے' اس پر توجہ دی جانی چاہیے۔

میرے سامنے ایک عامی کی حیثیت سے اس کی ایک دوسری اور عظیم تر مصلحت آئی ہے اور وہ یہ کہ آمدنی کا صحیح صحیح حساب رکھنا ''لانا ہے جوئے شیر کا!'' کا مصداق ہے۔ اور اس کے لیے بہت لمبے چوڑے اور elaborate accounting کی ضرورت ہے' جبکہ اسلام کے نظامِ محاصل میں سے اکثر کے لیے اس کی کوئی حاجت نہیں رہتی۔ اب ظاہر ہے کہ بڑے بڑے شراکتی اداروں یا limited companies کے لیے تو تفصیلی

حساب کتاب ویسے بھی ناگزیر ہے تاکہ حصہ داروں کے مابین منافع کی تقسیم منصفانہ ہو سکے' اور اگر یہ ادارے اپنے حجم (size) کے اعتبار سے اس accounting پر زرِ کثیر صرف کریں تو کوئی زیادہ بار بھی نہ ہوگا۔ لیکن آبادی کی عظیم اکثریت جو چھوٹے چھوٹے کاروبار لیے بیٹھی ہے اس کے لیے حساب کتاب کا یہ معاملہ خالص دردِ سر بھی ہے اور محض ضیاع بھی۔ یہ معاملہ چھوٹے چھوٹے دکانداروں ہی کا نہیں ہے' ہمارے درمیانی طبقے کی عظیم اکثریت کا ہے۔ آپ ایک ڈاکٹر کا تصور کریں جو روزانہ اوسطاً سوڈیڑھ سو مریض دیکھتا ہے' اب اگر وہ اپنی آمدنی کا صحیح صحیح حساب رکھنا چاہے اور وہ بھی ایسا جو انکم ٹیکس آفیسر کے نزدیک ''قابلِ تصدیق'' ہو تو اسے ہر مریض کا نام اور اس کو روزانہ دی جانے والی ادویات کی تفصیل کے علاوہ ادویات کی خرید وفروخت کا پورا حساب اور ان کا مکمل سٹاک اکاؤنٹ رکھنا ضروری ہوگا جس کے لیے ایک کلرک اور ایک اکاؤنٹینٹ کی خدمات لازمی ہیں۔ اور ان سب پر جو خرچ آئے گا وہ خالص non-productive ہوگا۔ وقِس علٰی ذٰلک۔ اس کے برعکس اسلام کے نظامِ محاصل میں اس کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہر شخص سال کے آخر میں اپنی مالی حالت کا حساب بآسانی کرسکتا ہے اور اس پر زکوٰۃ ادا کرسکتا ہے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ !

❁❁❁

عُشری اور خراجی اراضی

پاکستان میں عُشری نہیں صرف خراجی زمین ہے

پروفیسر رفیع اللہ شہاب

اسلامی ریاست میں حکومت کی آمدنی کی سب سے بڑی مد خراجی زمین ہے' اور آج بھی اس مد سے اتنی آمدنی حاصل ہو سکتی ہے کہ کسی مزید ٹیکس کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اسلامی قانون کے مطابق تمام مفتوحہ ممالک' جن میں برصغیر پاکستان و بھارت شامل ہیں' کی اراضی خراجی کے ذیل میں آتی ہیں۔ تمام اسلامی ادوار میں اس اسلامی قانون پر سختی سے عمل ہوتا رہا ہے' یہاں تک کہ ۱۷۹۳ء میں انگریزوں نے بنگال کے بندوبست دوامی کے ذریعے یہاں کی اراضی کی حیثیت بدل دی اور غیر حاضر زمینداروں کا ایک طبقہ پیدا کر دیا۔ ان زمینداروں نے اپنی طرف سے عشر ادا کرنا شروع کیا اور کوشش کی کہ علماء اس کے جواز کا فتویٰ دیں' لیکن چونکہ ایک دفعہ خراجی قرار دی ہوئی زمین ابد تک عشری میں تبدیل نہیں کی جا سکتی' اس لیے دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء میں اس بارے میں جو سینکڑوں فتوے پوچھے گئے ان سب کا یہی جواب دیا گیا کہ یہ اراضی کسی صورت میں عشری میں تبدیل نہیں ہو سکتی۔ ہاں' احتیاطاً کوئی عشر ادا کر دے تو اس کی اپنی مرضی ہے۔

اس موضوع پر راقم کا ایک مفصل مضمون نوائے وقت میں شائع ہو چکا ہے۔ مجھے توقع تھی کہ علماء کرام اس سلسلے میں کچھ وضاحت فرمائیں گے' لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے ہاں اسلامی نظام کے نفاذ کے نعرے تو تیس سال سے لگ رہے ہیں لیکن اس مقصد کے لیے جس قدر ''ہوم ورک'' کی ضرورت ہے اس سے پہلوتہی کی جاتی رہی۔ اس موضوع پر راقم نے پندرہ سال پہلے تحقیقی کام شروع کیا اور ۱۹۶۹ء میں اسلام آباد میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس میں ایک مختصر سی میٹنگ میں اسلامی نظریاتی کونسل کے اس وقت کے چیئرمین علامہ علاؤالدین صدیقی نے نظامِ عُشر پر گفتگو شروع کی تو راقم نے بہت سے اہل علم کی موجودگی میں اس کی تصحیح کی کہ ہمارے ملک کی اراضی ''خراجی'' کے ذیل میں آتی ہیں جن پر عشر کا اطلاق

نہیں ہوتا۔ اور اس کے ساتھ ہی اسلامی فقہ کی معتبر کتابوں سے تمام حوالہ جات ان کے سامنے رکھ دیے۔ علامہ شاہ محمد جعفر پھلواری اور ادارہ تحقیقات اسلامی کے سکالروں نے میرے نقطۂ نظر کی تائید کی۔ چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ میں نظریاتی کونسل کی رہنمائی کے لیے ایک مسلسل کتاب اس موضوع پر تیار کردوں جس کی نگرانی مسٹر خالد اسحاق ایڈووکیٹ کریں گے جو اس وقت اسلامی نظریاتی کونسل کے ایک سینئر رکن تھے اور آج بھی اس منصب پر فائز ہیں۔ راقم نے خالد صاحب کی لائبریری میں بیٹھ کر دو ماہ میں مطلوبہ کتاب تیار کر کے ان کے حوالے کی اور ساتھ ہی اس کے مطابق ۷۹-۱۹۷۸ء کا قومی بجٹ بھی بنا دیا جس میں موجودہ ٹیکسوں میں سے ایک ٹیکس بھی نہ تھا۔ میرا تحقیقی کام ان حضرات کے لیے اچنبھے کی بات تھی' اس لیے انہوں نے مختلف ذرائع سے اسے چیک کرایا۔ ادارہ تحقیقات اسلامی کے اسکالروں نے بھی اس کی تصدیق کر دی اور پھر ادارہ نے اسے کتاب کی صورت میں ''اسلامی ریاست کا مالیاتی نظام'' کے عنوان سے شائع کر دیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب جب زکوٰۃ اور عُشر آرڈیننس نافذ کیا گیا ہے تو اسلامی نظریاتی کونسل کے سامنے یہ تفصیلات نہیں تھیں۔ اتفاق سے انہی دنوں مسٹر خالد اسحاق ایڈووکیٹ جن کی نگرانی میں راقم نے یہ تحقیقی کام کیا تھا' ادارہ تحقیقات اسلامی میں تشریف لائے' جہاں اسکالر اسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ راقم نے خالد صاحب کو یاد دلایا کہ انہوں نے عشر کا نیا قانون بناتے وقت پچھلے تمام تحقیقی کام کو نظر انداز کر دیا ہے اور ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ان کے گوش گزار کی کہ اُمّتِ مُسلمہ کے ستر فقہی مذاہب کہ جن میں سے اکثر اب ختم ہو چکے ہیں' کے تمام فقہاء کا اس امر پر اتفاق ہے اور اسلامی فقہ کی ڈیڑھ ہزار کتابوں میں کوئی ایسی دلیل نہیں ملتی جس کے تحت پاکستان کی اراضی کو عُشری کے ذیل میں لایا جاسکے۔ ادارہ تحقیقات اسلامی کے اسکالروں نے تو کچھ ناراضگی کا بھی اظہار کیا کہ یہ ادارہ اسلامی قانون کے نفاذ کے لیے تحقیقی مواد فراہم کرنے کی خاطر قائم کیا گیا' لیکن اگر ان کی تحقیق کو درخور اعتنا نہیں سمجھا جاتا تو پھر اس ادارے پر غریب عوام کے کروڑوں روپے خرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں نے خالد صاحب سے یہ بھی درخواست کی کہ صدر صاحب نیک نیتی سے اسلامی قانون نافذ کرنا چاہتے ہیں' اس لیے خدا کے لیے ان کے سامنے صحیح تفصیلات پیش کی جائیں۔ خالد صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ نظریاتی کونسل کے چیئرمین کی توجہ اس طرف دلائیں گے۔ علمائے کرام کو اس مسئلہ کی اہمیت کی طرف توجہ دلانے کے لیے فقہ کی ابتدائی کتاب ''مالابُدّ منہ'' کا حوالہ یہاں غیر مناسب نہ

ہوگا۔ یہ کتاب کروڑوں کی تعداد میں شائع ہوتی ہے اور مصنف نے علماء حضرات کو نظریاتی بحثوں میں گم ہونے سے بچانے کے لیے اس میں سے وہ تمام بحثیں خارج کر دی ہیں جن کا برصغیر پاکستان و بھارت سے کوئی تعلق نہیں۔ عُشر کا مسئلہ انہوں نے ایک چوتھائی سطر میں حل کر دیا ہے کہ چونکہ برصغیر میں کوئی عُشری زمین نہیں اس لیے عُشر کے مسائل بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اور آخر میں فقہ کی سب سے بڑی کتاب ''فتاویٰ عالمگیری'' کا ایک حوالہ ملاحظہ ہو جس کے مطابق اگر کسی مسلمان علاقے پر دشمن کچھ عرصے کے لیے غالب آ جائے اور مسلمان اسے پھر دوبارہ حاصل کر لیں تو اس کی اراضی اپنی اصل یعنی خراجی حیثیت کی طرف لوٹ آئیں گی (جلد سوم، اردو ایڈیشن، ص ۵۲، مطبوعہ شیخ غلام علی لاہور)۔ امید ہے علماء حضرات فقہ کی کتابوں میں اس مسئلہ کا مطالعہ فرما کر اس کی صحیح اسلامی حیثیت عوام کے سامنے لائیں گے۔

خدا آں ملتے را سروری داد!
کہ تقدیرش بدستِ خویش بنوشت
بہ آں قومے سروکارے نہ دارد
کہ دہقانش برائے دیگراں کشت

☆

جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہ ہو روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

☆

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب
از جفائے دِہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب
انقلاب!
انقلاب ——— اے ——— انقلاب!
(اقبال)

مرکزی **انجمن خدّام القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان — اور — سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے **علم و حکمت** کی

وسیع پیمانے — اور — اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک پا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ — اور — غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ

SBU401S